کیپٹن نور احمد قائم خانی (آرٹلری) - عنایت اللہ
فتح گڑھ سے فرار
قیدی کیمپ نمبر 45 سے پاک فوج کے افسروں کے فرار کی روئیداد
مکتبہ داستان

ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- ❖ گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- ❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- ❖ کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ❖ ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- ❖ اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- ❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- ❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ❖ عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- ❖ **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- ❖ اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو

فتح گڑھ سے فرار

کیپٹن نور احمد قائم خانی (آرٹلری)
عنایت اللہ

واحد تقسیم کار
علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

نام کتاب	....	فتح گڑھ سے فرار
مصنف	....	کیپٹن نور احمد قائم خانی (آرٹلری)
ناشر	....	عنایت اللہ وقاص شاہد مکتبہ داستان، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	....	دسمبر 2009ء
قیمت	....	-/140 روپے

☆ ملنے کے پتے ☆

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔

کتاب گھر
کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

اشرف بک ایجنسی
کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

انوار الادب لائبریری
تغلق روڈ۔ لوملا تولیخان۔ ملتان
Mob 0314-6134483

فہرست

فرار کا فیصلہ اور عمل

باقی دو کی داستان

قبلہ والدِ بزرگوار کے نام
جن کی تربیت نے مجھے
یہ جذبہ بخشا

پیش لفظ

یہ بھارت کے قیدی کیمپ نمبر ۴۵، فتح گڑھ، سے پاک فوج کے پانچ افسروں کے فرار کی تفصیلی داستان ہے جو فرار ہونے والے ایک افسر، کیپٹن نور احمد قاسم خانی (آرٹلری) سنا رہے ہیں۔ انہوں نے کئی مہینے صرف کر کے دو سو دس فٹ لمبی سرنگ کھودی اور اس سے نکلنے والی کئی ٹن وزنی مٹی بھارتیوں کی آنکھوں میں جھونک کر نہ صرف کیمپ سے نکلے بلکہ پورے بھارت میں سے گذر کر پاکستان پہنچے تھے۔

پاکستان کے اخبار اور رسالے ابھی تک دوسری جنگ عظیم کے جنگی قیدیوں کے فرار کی کہانیوں کے ترجمے چھاپے جا رہے ہیں یہ کہانیاں زیادہ تر برطانوی اور امریکی فوجیوں کی ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ کہانی کی تلاش کی نسبت ترجمہ سہل کام ہے۔ انگریزی کی کوئی کتاب یا رسالہ اٹھایا اور جو کہانی اچھی لگی ترجمہ کر کے قارئین کے آگے رکھ دی۔

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اپنی فوج اور اپنے معاشرے میں ایک کہانی کی تلاش میں نکلو تو دس کہانیاں ملتی ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر ولولہ انگیز اور ایمان افروز جو آپ پڑھیں تو ترجمے بھول جائیں۔ لیکن تلاش کے لئے ایڈیٹری کی مسند سے اٹھنا اور گلی گلی، گاؤں گاؤں چھاؤنی چھاؤنی کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ اسی تگ و دو سے بچنے کے لئے ہمارے اخبار رسالے ترجمہ کا سہارا لیتے ہیں۔ شکار اور مہم جوئی جیسی ترجمہ کہانیاں صرف اس وجہ سے برداشت کی جا سکتی ہیں کہ یہ صرف تفریح سے تعلق رکھتی ہیں، مگر بات جب قومی جذبے اور شجاعت کی ہو تو ہمیں بحیثیت مسلمان اور پاکستانی اپنے ہی ملی جذبے اور شجاعت کو اجاگر کرنا چاہئے تاکہ روایات کا سلسلہ آگے چلے اور یہ ورثہ جس طرح چودہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے، اسی طرح ہمارے بچوں کی سوچوں اور ان کے کردار میں منتقل ہوتا چلا جائے۔

میں ذاتی طور پر جنگِ عظیم کی ترجمہ کہانیوں کا مخالف نہیں۔ بہادری اور جذبۂ ایثار کی کہانی کسی بھی ملک کی ہو وہ ہمارے بچے ضرور پڑھیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ زندہ و بیدار قوموں کے بیٹے اور بیٹیاں اپنے قومی وقار کے تحفظ کی خاطر کس طرح لہو کے نذرانے دیتی ہیں، مگر پاکستانی شجاعت سے نظریں پھیر کر صرف انگریزوں اور امریکیوں وغیرہ کی بہادری کی کہانیاں سنائے چلے جانے سے ہمارے بچوں کو یہ تاثر مل رہا ہے کہ بہادری صرف انہی قوموں کے حصّے میں آئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچے اپنی عسکری روایات اور شجاعت سے نا آشنا ہیں۔

"حکایت" میں بھی آپ نے جنگِ عظیم کی کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ پرچے میں اپنی روایات کو غالب رکھا جاتا ہے۔ یہ "حکایت" کا مشن ہے کہ اپنے بچوں کو اپنی روایات سے آگاہ رکھا جائے — اور یہ کتاب "فتح گڑھ سے فرار" اسی مشن کی ایک کڑی ہے۔

"فتح گڑھ سے فرار" صرف فرار کی نہیں اُس جذبے کی کہانی ہے جو پاکستان کو معرضِ وجود میں لایا تھا اور جس کی بدولت پاکستان تند و تیز طوفانوں میں بھی زندہ و پائندہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے المیئے نے قوم پر افسردگی طاری کر دی ہے۔ مفاد پرست اور پاکستان دشمن عناصر نے بے بنیاد پروپیگنڈے سے اس افسردگی کو اور زیادہ گہرا اور گھناؤنا کر دیا ہے۔ شکست کی تمام تر ذمہ داری افواجِ پاکستان پر ڈال کر پاکستان کی عسکری روایات پر مٹی ڈالنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ لکھنے والوں نے یہاں تک لکھ ڈالا ہے کہ جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی شجاعت کی جو کہانیاں سنائی جاتی رہی ہیں وہ سب افسانے تھے۔ قوم کو چونکہ شجاعت کی کہانیاں سنائی ہی نہیں گئیں اس لئے یہی تاثر عام ہو گیا کہ ہماری افواج لڑنے کے قابل ہی نہیں۔

جب دو فوجیں لڑتی ہیں تو ایک کو فتح اور ایک کو شکست ہوتی ہے۔ یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ یہ دیکھتی ہے کہ شکست کھانے والوں کا ردِ عمل کیا ہے۔ شکست کھانا اور بات ہے اور شکست تسلیم کر لینا دوسری بات۔ ہتھیار ڈال دینا اور بات ہے اور ہتھیار پھینک کر دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دینا دوسری بات۔ ہارا ہوا اسے کہتے ہیں جو شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈالے اور گھٹنے ٹیک دے۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوا۔ کچھ تو حالات دشوار

اور مخالف تھے، زیادہ تر حالات ایسے پیدا کئے گئے جن سے مجبور ہو کر ہماری افواج نے ہتھیار ڈالے لیکن اپنا جذبہ دشمن کے حوالے نہیں کیا۔ مشرقی پاکستان کے میدانِ حشر میں شجاعت کے جو کارنامے ہوئے ہیں وہ جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی نسبت زیادہ ہیں اور کہیں زیادہ حیران کن۔ دشمن کے جرنیلوں اور وقائع نگاروں نے تعصب کے باوجود ہماری افواج کی شجاعت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بھارت میں بعض فوجی مبصروں نے یہاں تک کہا ہے کہ مشرقی پاکستان میں پاکستان کی شکست فوجی شکست نہیں۔

ہمارے افسر اور جوان بھارت کے جنگی قیدی بنے تو ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے، وہ جذبے اور قومی وقار سے لیس تھے۔ اپنے سیاسی لیڈر اور بھارت کے لشکر ان سے یہ دونوں ہتھیار نہیں ڈلوا سکے۔ جذبے اور وقار سے محروم کرنے کے لئے دشمن نے قیدی کیمپوں میں انہیں لالچ دیئے، دھمکیاں دیں، نہایت اچھا سلوک کر کے بھی دیکھا، BRAIN WASHING کے کئی طریقے آزمائے، انہیں غیر انسانی اذیتیں بھی دیں، کئی ڈھنگ استعمال کر کے انہیں ذلیل و رسوا کرنے کی بھی کوشش کی لیکن دشمن کامیاب نہ ہو سکا۔ ہمارے مجاہدوں نے ہندو کی قید کو قبول نہ کیا۔ یہ اسی جذبے اور وقار کا کرشمہ تھا کہ کئی جوانوں نے بھارتی افسروں کا حکم ماننے سے انکار کیا، سنتریوں اور گارڈوں سے لڑے اور بھارتیوں کی گولیوں سے شہید ہوئے۔

فرار کی کوششیں بے شمار ہوئیں۔ کچھ کامیاب ہوئیں بعض ناکام۔ متعدد کیمپوں میں سرنگیں کھودی گئیں، پکڑی گئیں اور کھودنے والوں کو بھوکا پیاسا اذیتوں کی چکی میں پیسا گیا۔ بعض جوانوں نے خاردار تار پھلانگنے کی کوشش کی اور دشمن کی گولیوں سے شہید ہوئے۔ بھارتی افسر اکثر جنگی قیدیوں سے کہتے تھے کہ انہیں قید میں تکلیف ہی کیا ہے جس سے وہ بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"ہم نے تم سے شکست نہیں کھائی۔ ہم تمہاری قید کو قبول کر ہی نہیں سکتے": یہ تھا جواب ہمارے ہر ایک افسر اور جوان کا۔

یہی جذبہ تھا جس نے پاک فوج کے پانچ افسروں — میجر نادر پرویز، میجر طارق پرویز، کیپٹن نور احمد قائم خانی، کیپٹن ظفر حسین گل اور لیفٹیننٹ ایلیمی — کو فتح گڑھ کے قیدی کیمپ نمبر ۴۵

سے فرار ہونے پر مجبور کیا۔ ان میں سے دو (کیپٹن ظفر حسین گل اور لفٹیننٹ لیلین) کی کہانی "حکایت" کے شمارہ دسمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی جو میں نے قلمبند کی تھی۔ باقی تین (میجر نادر پرویز، میجر طارق پرویز اور کیپٹن نور احمد) کی کہانی کیپٹن نور احمد خود ہی سنا رہے ہیں۔ وہ چونکہ فرار ہونے والوں میں سے ہیں اسلئے وہ ہر اس لمحے کی جو انہوں نے سرنگ کے اندر اور سرنگ سے باہر گذارا اور ہر اس قدم کی جو انہوں نے بھارت کی دھرتی سے نکلنے کے لئے اٹھایا مکمل تفصیل پیش کر رہے ہیں۔ وہ ڈرامائی اور سنسنی خیز طریقے سے فتح گڑھ سے غائب ہوئے۔ چھپتے پھرے۔ آسمان سے گرنے اور کھجور میں اٹکنے سے کئی بار بال بال بچے۔ ان کے فرار کی خبر بھارت کے اخباروں میں شائع ہو چکی تھی۔ پولیس اور فوج ان کے تعاقب اور تلاش میں سرگرم ہو گئی تھی اور وہ ابھی بھارت میں ہی گھوم پھر رہے تھے۔

میں اپنا قلمبند کیا ہوا حصہ جو کیپٹن ظفر حسین گل اور لفٹیننٹ لیلین سے تعلق رکھتا ہے، کتاب میں دوسرے حصے کے طور پر شامل کر رہا ہوں۔ یہ دو نو افسر سرنگ سے باقی تین افسروں سے ایک گھنٹہ بعد نکلے تھے۔ باقی تین پہلے نکل کر غائب ہو گئے تھے اس لئے سرنگ سے نکل کر ان دونو پارٹیوں کے فرار کی روئیداد الگ ہو جاتی ہے۔

"فتح گڑھ سے فرار" پڑھیں اور خود فیصلہ کریں کہ انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں یا اپنی شجاعت کی داستانیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

پاسنگ آوٹ پریڈ اور کاکول سے روانگی

۱۲۔ جون ۱۹۷۰ء کا سورج میرے لئے اور دوسرے کئی کیڈٹس کے لئے پیغامبرِ فرطِ انبساط اور موجبِ کیف و سرور بن کر طلوع ہونے والا تھا۔ ہم تمام کیڈٹ جو پاس آوٹ ہو کر کمیشن پانے والے تھے پاسنگ آوٹ پریڈ کی تیاریوں میں مصروف تھے ہر طرف ہشاش بشاش چہرے تھے۔ اپنے مقصد میں کامیابی پانے کی خوشی میں ہر ایک جیسے ایک دوسرے سے پوشیدہ دل ہی دل میں اپنے رب العزت کا شکر ادا کر رہا تھا اور سب ہی اس گھڑی کے منتظر تھے جو اُن کی زندگی میں ایک عظیم تبدیلی لانے والی تھی۔

۱۲۔ جون کا سورج بڑی شان سے طلوع ہوا اور ایبٹ آباد کی وادی کو اپنی روپہلی کرنوں سے منور کرنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے یہاں کی ہر چیز ہماری خوشیوں میں شریک ہے اور اپنی تمام تر رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ ہمیں مبارک باد پیش کر رہی ہے۔ سب لوگ ہی خوش تھے۔ مگر میں کچھ زیادہ ہی مسرور تھا کیونکہ کمیشن ملنے کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان جا رہا تھا۔ مشرقی پاکستان دیکھنے کی تمنا ایک عرصے سے دل میں مچل رہی تھی، اور جلد ہی میں اپنے تصورات کی "آماجگاہ" میں جانے والا تھا۔ خواہش پوری ہونے پر کس قدر خوشی ہوتی ہے۔ یہ وہی جانتے ہیں جن کی خواہش کبھی پوری ہوئی ہو۔ سات بجے کا عمل تھا۔ ہم فوجی گاڑیوں میں بیٹھ کر پریڈ گراونڈ کی طرف جا رہے تھے۔ کاکول کا موسم روح پرور ہوتا ہے۔ جون

کے مہینے میں تو کاکول کی صبحیں بہت پُرکیف و سرور ہوتی ہیں۔ فوجی گاڑیاں پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول کے کیفے ٹیریا کے قریب پہنچ کر رک گئیں۔ اور کیڈٹ اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کی کلف لگی وردیاں جو انہوں نے دولہوں کی طرح بڑے پیار سے اور بڑے ارمانوں سے تیار کر کے پہنی تھیں کہیں سے خراب نہ ہو جائیں، گاڑی سے اترے اور ہمیں پریڈ کے بارے میں آخری ہدایات دی گئیں۔

پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں بہت ہی زیادہ چہل پہل تھی۔ پریڈ گراؤنڈ میں اعلٰے فوجی افسر، سفارتی نمائندے اور پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹس کے احباب و اعزا اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ دوسری طرف زیرِ تربیت کیڈٹس بہت خوب صورت وردیاں پہنے سپاہیانہ شان سے بیٹھے تھے۔

مہمانِ خصوصی کے آنے میں چند ہی منٹ باقی تھے تمام انتظامات کو آخری شکل دے دی گئی تھی۔ پریڈ کو ترتیب کے لحاظ سے صفوں میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ ایک ایک منٹ ایک ایک گھڑی سے زیادہ بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہو۔ دل کی دھڑکنیں تیز اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ خدا خدا کر کے مہمانِ خصوصی کی آمد کا بگل بجا۔ کیڈٹس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ نیک اور ارمانوں بھری گھڑی آن پہنچی تھی جس کا ہر کیڈٹ کو بڑی بے چینی سے انتظار ہوتا ہے۔ پریڈ کو پریڈ گراؤنڈ میں جانے کا حکم دیا گیا۔ پریڈ فوجی بینڈ کی پُرجوش دھن پر مارچ کرتی ہوئی پریڈ گراؤنڈ کی طرف بڑھی۔ ہر ایک کے دل میں ایک جوش تھا۔ ولولہ تھا، عزم اور یقین تھا۔ انشاء اللہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر خدا اور قوم کے سامنے سرخ رُو ہوں گے۔

مہمانِ خصوصی نے پریڈ کا معائنہ کرنے کے بعد نمایاں طور سے کامیاب ہونیوالے کیڈٹس کو اعزازات دیئے۔ اور پھر پریڈ کو برخاست کر دیا گیا۔ انسٹرکٹروں، احباب اور اعزا نے کامیاب ہونے والوں کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ اور پھر تمام

کیڈٹس جلد سے جلد اپنے گھروں کو روانہ ہونے کیلئے تیاریاں کرنے لگے۔

میں اپنے والدِ بزرگوار اور برادرِ نسبتی کے ساتھ راولپنڈی کے لئے روانہ ہو گیا۔ کاکول کو چھوڑتے ہوئے دکھ بھی ہُوا۔ اس جگہ کے ساتھ میری زندگی کی بہترین یادیں وابستہ ہیں۔ اُس روز جدائی کے غم کی شدت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جگہ مجھے کتنی پیاری ہے۔ مگر جیسا کہ زندگی میں اکثر پیاری چیزیں انسان سے جدا ہو جایا کرتی ہیں، اس جگہ کو بھی میں نے بادلِ نخواستہ الوداع کہا تھا، اور کوشش کی تھی کہ جدائی سے پہلے یہاں کی ہر چیز کی رعنائی اور دلکشی کو اپنے دل کی گہرائیوں میں بسا لوں۔ پھر کاکول نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں یوم کی رخصت گذارنے کے بعد میں مشرقی پاکستان جانے کے لئے کراچی پہنچ گیا۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ اور کراچی کا موسم مرطوب مگر بادلوں کی وجہ سے موسم کافی خوشگوار ہو گیا تھا۔ گیارہ بج کر دس منٹ پر پی آئی۔ اے کا طیارہ کراچی سے ڈھاکہ کے لئے پرواز کرنے والا تھا۔ میں طیارے میں بیٹھا اپنی معلومات کی مدد سے پاکستان کے سنہرے دیس کا تصوراتی خاکہ بنانے میں مگن تھا کہ ایئر ہوسٹس کی آواز میرے تصوروں کی دنیا میں مخل ہوئی۔ ایئر ہوسٹس اُردو بنگالی اور انگریزی میں طیارے کی پرواز کا اعلان کر رہی تھی اور مسافروں سے پیٹیاں SEAT BELTS باندھنے اور تمباکو نوشی نہ کرنے کی درخواست کر رہی تھی۔ طیارے نے حرکت کی اور ہر ایک نے اللہ تعالےٰ کے حضور دُعا مانگی کہ سفر خیریت سے اختتام پذیر ہو۔

سفر آرام دہ اور پُرسکون تھا۔ اڑھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد ایک بار پھر ایئر ہوسٹس مسافروں کو اپنی طرف متوجہ ہونے کی درخواست کر رہی تھی۔ اور جب ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ کچھ لمحوں بعد ہم ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں تو دل خوشی سے اچھل پڑا باہر نگاہ جو دوڑائی تو چاروں طرف مسحور کن مناظر پائے۔ ہوائی منظر اس قدر پیارا تھا کہ نگاہ ہٹانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ تا حدِ نگاہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت بھاشا اور انکے چاروں طرف کیلے کے درخت عجیب تاثر انگیز ماحول پیدا کر رہے تھے۔

بوڑھی گنگا بھی اپنی مست خرامی سے دل لبھا رہی تھی۔ طیارہ آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا اور
ذرا ہی دیر بعد رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ سیڑھی لگائی گئی۔ طیارے
کے کپتان نے مسافروں کو خدا حافظ کہا۔ اب مسافر طیارے سے نکلنے لگے۔ باہر آنے پر
علم ہوا کہ ہلکی ہلکی پھوار ہمارا استقبال کر رہی ہے۔ بہت ہی حسین منظر
تھا۔ سورج بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ مجھے لینے کے لئے میری رجمنٹ
کا ایک آفیسر ائیرپورٹ پر موجود تھا۔ ائیرپورٹ سے باہر آئے، فوجی گاڑی میں بیٹھے
اور اپنے میس کی طرف روانہ ہو گئے۔

میس پہنچ کر رجمنٹ کے دوسرے افسروں سے ملاقات ہوئی۔ سب نے خوش
آمدید کہا۔ اور کافی دیر تک خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ فارغ ہو کر اپنے کمرے کا
رخ کیا۔ تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد غسل کیا اور کمرے سے باہر آگیا۔ شام کے تقریباً
ساڑھے چھ بجے تھے۔ منظر بہت ہی حسین تھا۔ آوارہ بادل ادائے بے نیازی کا اظہار
کر رہے تھے، اور ہوا کے جھونکے جسم و جان کی تمام آلائشوں کو پاک کرنے کی کوشش
کر رہے تھے۔ پہلے ہی دن بنگال کے موسم نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔

میں مشرقی پاکستان اُن دنوں میں پہنچا تھا جب عام انتخابات کے لئے زور شور
سے تیاریاں اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہنگامے اور عصبیت مشرقی
پاکستان کے سنہرے پن کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔

ڈھاکہ شہر کا سکون تہہ و بالا ہو چکا تھا۔ سیاسی ہلڑ بازی نے روزمرہ کی زندگی کو بری
طرح سے متاثر کر رکھا تھا۔ کہیں عوامی لیگ کے احتجاجی جلسے ہوتے تھے تو کہیں مولانا
بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کے کارکنان قانون کا مذاق اڑاتے تھے۔

ایک بات جو میں نے محسوس کی اور جس نے میرے لئے دن کا چین اور راتوں کی
نیندیں حرام کر دی تھیں وہ یہ تھی کہ کچھ سرکردہ لیڈر خفیہ طریقے سے بنگالیوں کے ذہنوں
میں عصبیت کا زہر بھر رہے تھے جس کا کبھی کبھار اظہار بھی ہو جایا کرتا تھا، مگر
افسوس یہ تھا کہ اس کی روک تھام کے لئے کسی بھی طرف سے کوئی مؤثر کارروائی

نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت دن بدن بڑھتی گئی۔ اپنے
ہی غیر نظر آنے لگے۔ میں مشرقی پاکستان کا سیاسی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا نہ ہی
میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہوں۔ میں تو صرف وہ پس منظر بیان کر رہا ہوں۔ جس میں
عام انتخابات ہوئے تاکہ عام قاری کم از کم یہ اندازہ لگا سکے کہ اگر زخم کی طرف فوری
توجہ نہ دی جائے تو اس کا ناسور بن جانا لازمی امر ہوتا ہے۔

عام انتخابات

عام انتخابات کی نگرانی کے سلسلے میں تنگیل جانے کا اتفاق ہوا۔ تنگیل ڈھاکہ
سے شمال مغرب کی طرف تقریباً ستر میل دور ایک ضلع ہے۔ تنگیل سے صرف تین میل
دور مولانا بھاشانی کا آبائی گاؤں سنتوش ہے۔ ہمارا کنٹرول ہیڈ کوارٹر تنگیل ریسٹ ہاؤس
میں تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس شہر سے تھوڑا باہر ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے بالکل قریب تھا۔

میں روزانہ صبح مختلف دیہی علاقوں میں RECONNAISSANCE
کے لئے نکل جایا کرتا تھا۔ اس سے مجھے اس ضلع کے اندرونی اور پسماندہ علاقے دیکھنے کا
موقع ملا۔ کئی علاقے ایسے تھے جہاں کے لوگوں نے جیپ پہلی بار دیکھی تھی۔ جونہی میری
جیپ کسی ایسی جگہ پہنچی، بچے، جوان، بوڑھے اور عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہو جایا کرتی
تھیں۔ میں اپنے ساتھ کچھ بنگالی سپاہی رکھتا تھا تاکہ بات کرنے میں آسانی ہو۔ مختلف
عمر کے لوگوں سے باتیں ہوتی تھیں، اور ان باتوں سے میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل
نہ تھا۔ کہ موقع پرست، خودغرض اور متعصب لیڈروں کے پروپیگنڈے کا زہر یہاں تک
بھی پہنچ چکا ہے۔ ایسے سادہ اور مفلوک الحال لوگوں کے ذہنوں میں بھی یہ بات پختہ
کر دی گئی تھی کہ ان کی بدحالی کے ذمہ دار غیر بنگالی ہیں۔ کاش انہیں کوئی سمجھانے والا ہوتا
تو ہم سب مسلمان بھائیوں کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا اور نہ ہی ہم ایک دوسرے کے خون کے
پیاسے ہوتے۔

جہاں تک انتخابات کے نتائج کا تعلق ہے، میری رائے تو پہلے سے یہی تھی کہ مجیب بھاری اکثریت سے جیت جائے گا۔ مگر یہ توقع نہیں تھی کہ وہ سو فیصد کامیابی حاصل کرے گا۔ بہر حال نتائج کوئی ایسے خلاف توقع نہیں تھے۔

الیکشن کے بعد ہم واپس ڈھاکہ آگئے اور پھر مارچ ۱۹۷۱ء تک وہیں رہے۔

خون میں ڈوبا ہوا مارچ ۱۹۷۱ء

اس منحوس مہینے میں جو کچھ ہوا اس کے لئے الگ الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ بقول شاعر۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اس مہینے میں وہ حادثے اور دل سوز واقعات رونما ہوئے جنہیں یاد کر کے آج بھی میرا دلِ غم کے آنسو روتا ہے۔ آسمان کی آنکھ نے شاید صدیوں بعد مسلمان کو مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا۔ مسلمان خواتین کی عصمتیں اپنے مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں لٹتے دیکھا۔ مسلمانوں کو اپنے ہی معصوموں کے خون سے ہولی کھیلتے دیکھا اور اتنا کچھ دیکھا کہ شاید اس سے پہلے نہ دیکھا ہو۔ اپنے ہی ملک کی سرزمین لوگوں پر تنگ کر دی گئی۔ ان کی زندگی بھر کا اثاثہ آناً فاناً آگ کی نذر کر دیا گیا، اور انہیں جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان حالات کی وجہ سے مارچ میں فوجی کارروائی کی گئی جس نے غیر ملکی طاقتوں کو ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع دیا۔ میں ضمناً ان واقعات کا ذکر کر رہا ہوں ورنہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ اس پر تو ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

مشرقی پاکستان سے مفرور خود غرض سیاسی لیڈروں نے ہندوستان میں پناہ لی اور اپنے آقاؤں کے زیرِ سایہ اپنے ناپاک منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں منہمک ہو گئے۔ کچھ ہی عرصے میں انہوں نے ایک ریڈیو سٹیشن قائم کر لیا جس سے شر انگیز پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا۔ اپنی آزادی کا اعلان یہ ننگِ دین ۲۶ مارچ کو ہی کر چکے تھے۔

مُکتی باہنی

یہ باہنی FORCE ان افراد پر مشتمل تھی، جن کا تعلق پاکستان کی مسلح افواج کی ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان پولیس اور ایسٹ پاکستان رائفلز سے تھا۔[1] انہوں نے مارچ ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں کے ازلی دشمن ہندو کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اپنے ہی ساتھیوں اور بھائیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ غلط فہمیوں اور خود غرض سیاسی لیڈروں نے بھائی کو بھائی کے لیے درندہ بنا دیا تھا۔ اور دشمنوں کے گھروں میں چراغاں ہو رہا تھا۔ دنیائے اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ مگر فریقین اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ ان کا پھر

---

[1] کچھ عرصہ تک یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ مکتی باہنی انہی افراد پر مشتمل تھی جو مصنف نے لکھے ہیں۔ گذشتہ سال بھارت کے صفِ اول کے ایک لیڈر مرارجی ڈیسائی نے انکشاف کیا تھا کہ مکتی باہنی دراصل انڈین آرمی کی کمانڈو فورس تھی جسے بنگالی مسلمانوں کے روپ میں مشرقی پاکستان میں داخل کیا گیا تھا۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان رائفلز اور پولیس کے افراد باغی ہو گئے تھے ان میں سے کچھ ملٹری ایکشن میں مارے گئے یا پکڑے گئے اور باقی بھارت بھاگ گئے تھے۔

یکجا ہو جانا اک معجزہ سے کم نظر نہ آتا تھا۔

ہندو نے مسلح افواج کے ان مفرور افراد کو منظم کیا، اور ملٹری اکیڈیمی ڈیرہ دون انجان میں خاص کورس چلا کر ان کے لئے افسر تیار کئے باقی تمام لوگوں کے لئے مشرقی پاکستان کی سرحد کے قریب ہندوستانی علاقے میں تربیتی مراکز قائم کئے۔ جہاں پر دن رات ہندو ان باغیوں کو تربیت دینے میں مصروف ہو گئے۔ اگست ۱۹۷۱ء تک بہت بڑی تعداد کو باقاعدہ تربیت دی جا چکی تھی۔ جہاں تک ہتھیاروں کا تعلق ہے تو وہ ہندوستان ہی نے مہیا کئے سوائے کچھ ہتھیاروں کے جو باغی مفرور ہوتے وقت اپنے ساتھ لے گئے تھے ہندوستان نے ان باغیوں کو ایک چھوٹا سا توپخانہ بھی مہیا کیا جس میں فیلڈ گنیں تھیں۔

مشرقی پاکستان میں جنگ شروع ہونے سے پہلے اکثر باغی ہماری مسلح افواج کے افراد اور نہتے شہریوں پر حملے کرتے تھے۔ عموماً ان کا شکار محبِ وطن بنگالی اور غیر بنگالی ہوا کرتے تھے۔ مگر آفریں ہے اُن مردانِ حق پر جو کبھی زبان پر حرفِ شکایت نہ لائے۔ جانی اور مالی نقصانات ان کے پائے ثبات کو متزلزل نہ کر سکے۔ بلکہ وہ اس آزمائش کی بھٹی سے کندن بن کر نکلے۔ آج بھی جب ان سرفروشانِ اسلام کا تصور اپنے ذہن میں لاتا ہوں تو میرا وجود لرز اٹھتا ہے اور سر عقیدت سے جھک جاتا ہے۔ فرطِ جذبات سے آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے بلکہ میرا ایمان ہے کہ شہیدوں کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا اور انشاء اللہ جلد یا بدیر تعصب اور نفرت کی یہ دیواریں جو غاصبوں اور مفاد پرست لوگوں نے ہمارے درمیان کھڑی کر دی ہیں، منہدم ہو جائیں گی، اور ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے لئے جینے اور مرنے کا عزم کریں گے۔

قتلِ عام اور آبروریزی

ہندوستان اور دیگر اسلام دشمن طاقتوں نے پاک فوج کے خلاف مندرجہ بالا وہ الزامات کا اس قدر منظم پروپیگنڈہ کیا ہے کہ غیر تو غیر اپنے بھی یہ سوچنے لگے

ہیں کہ شاید ایسا ہوا ہے۔ بحیثیت ایک محبِ وطن کے میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ حقیقت کو کم از کم اپنے بھائیوں اور بہنوں تک تو پہنچا دوں۔ شاید یہ حقیر سی کوشش غلط فہمی دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ فوجی کارروائی سے پہلے مارچ کے مہینے میں خود غرض بنگالیوں اور بنگالی ہندوؤں نے جس درندگی کا مظاہرہ غیر بنگالیوں کے ساتھ کیا، اس کی مثال تاریخِ عالم میں شاید ہی نظر آئے۔ ہنستی کھیلتی بستیاں پل بھر میں ویرانوں میں بدل دی گئیں۔ خواتین کی عصمتیں بچوں کے سامنے تار تار کر دی گئیں جگر گوشوں کو ماں باپ کے سامنے ذبح کیا گیا۔ نابالغ بچیوں کو موت کے سرد ہاتھوں میں جانے سے پہلے تک ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ معصوم بچوں کے ٹکڑے کر دیئے گئے، اور اس طرح کے بہت سے واقعات رونما ہوئے جن کا تصور ہی جگر کو پاش پاش کرنے کے لئے کافی ہے۔ علاوہ ازیں پورے مشرقی پاکستان میں فوج کو چھاؤنیوں کی حدود میں گھیر لیا گیا، اور ہر قسم کی سپلائی کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ فوج کو اپنی مدافعت میں بھی کوئی کارروائی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کو مقامی لوگوں نے فوج کی کمزوری سمجھا اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

مجیب نے متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی، اور اس عرصے میں وہ تمام واقعات رونما ہوئے جن کا کبھی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں حادثاتی طور پر نہیں ہوئی تھیں بلکہ منظم طریقے پر کی گئی تھیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ دراصل نسل کشی کی مہم خود غرض بنگالیوں نے ہی چلائی تھی۔ اس طرح سے آبروریزی کے جتنے واقعات ہوئے وہ بھی انفرادی طور پر نہیں، بلکہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت اجتماعی طور پر کئے گئے۔

مغربی پاکستان کے باشندے اور غیر بنگالی جو اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکے، انہوں نے چھاؤنیوں میں پناہ لی۔ باوجود مشکلات اور مجبوریوں کے ہر جگہ ان بدقسمت لوگوں کو خوش آمدید کہا گیا۔ اور ان کے لیے جو کچھ ہو سکا وہ کیا گیا۔

جب تک فوجی کارروائی نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک صرف وہی باتیں معلوم ہوتی تھیں جو کوئی بچ نکلنے والا آکر بتاتا تھا۔ مگر جب فوجی کارروائی کی گئی تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ لاکھوں بے گناہوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ہزاروں بچوں کو معذور کر دیا گیا ہے

ہزاروں پاک خواتین کی عصمتیں لوٹی جا چکی ہیں، اور ہر طرف بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہے۔ ان حقائق کو جاننے کے بعد بہت سے لوگوں میں جذبۂ انتقام پیدا ہوا، مگر اس لاوے کو بہہ نکلنے کی اجازت کبھی بھی نہ دی گئی۔ مشرقی پاکستان پولیس فورس، ایسٹ پاکستان رائفلز وغیرہ کی بغاوت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور یہ ضروری ہو گیا کہ باغیوں کی مکمل طور پر سرکوبی کی جائے۔ باغیوں کو ہندوستانی تخریب کاروں کی بھرپور امداد حاصل تھی۔ اللہ کے فضل و کرم اور ہماری افواج کی کارکردگی سے بہت ہی قلیل عرصے میں حالات پر قابو پا لیا گیا۔ اور ماسوائے چند علاقوں کے ہر جگہ قانون کی حاکمیت قائم کر دی گئی۔

باغی عام طور سے لوگوں کے لباس میں چھپ کر حملہ کرتے یا گھات لگاتے تھے اور کسی گاؤں میں مرکز بنا لیا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں کارروائی کے دوران شاید کچھ سویلین بھی مارے گئے ہوں، ورنہ جہاں تک پالیسی کا اور حقیقت کا تعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ قتل کتنی بنگالیوں کی طرف سے تو ہوئی تھی، ہماری طرف سے کسی نے اس کا تصور تک بھی نہیں کیا۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ بنگالی خواتین کی آبروریزی کے کچھ واقعات ہوئے تھے مگر وہ یقیناً اس قدر کم تھے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ایسے قبیح جرم میں ملوث افراد کو خاطر خواہ سزائیں دی گئی تھیں۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ اس طرح ہے کہ ڈھاکہ میں ملٹری پولیس کے دو افراد نے اپنے آپ کو اس جرم میں ملوث کیا تھا۔ انہیں بعد میں باقاعدہ فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اور سزائیں دی گئیں۔ بغرض یہ کہ قتل اور آبروریزی کے واقعات ہوئے ضرور ہیں، مگر بہت ہی قلیل تعداد میں یہ جو لاکھوں کے حساب سے الزام لگایا جاتا ہے، وہ سراسر بہتان تراشی اور سفید جھوٹ ہے۔

تخریب کار — ڈھاکہ میں

مختلف علاقوں میں باغیوں کی سرکوبی کرنے اور حالات کو معمول پر لانے کے بعد

ہماری رجمنٹ واپس ڈھاکہ پہنچ گئی۔ مکتی باہنی کے شرپسند اور ہندوستانی تخریب کار ڈھاکہ شہر میں خاصے سرگرم تھے۔ عام شہری زندگی جو کہ معمول پر آ چکی تھی پھر مفلوج ہوتی نظر آ رہی تھی۔ غالباً یہ اگست ۱۹۷۱ء کا پہلا ہفتہ تھا۔ ہمیں ڈھاکہ شہر میں امن و امان بحال کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی یہ کام خاصا مشکل تھا۔ روزانہ کہیں نہ کہیں کسی قسم کی تخریبی کارروائی ہو جایا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ شاپنگ سنٹر اور سکول کالج تک بھی ان کے شر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان حالات کو معمول پر لانا ہمارے لئے ایک چیلنج تھا۔

ہم مسلسل پٹرولنگ کر کے اور اپنے مخبر ہر علاقے میں پھیلا کر بڑی ہی جانفشانی سے تخریب کاروں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ تخریب کاروں کا اڈا مگ بازار (ڈھاکہ) کے ایک مکان میں تھا۔ اس مکان سے بھاری تعداد میں ہتھیار اور ایمونیشن برآمد ہوا اور اس طرح اس گروہ کا سراغ بھی مل گیا۔ جو ان تخریبی کارروائیوں کا ذمہ دار تھا۔ ایک رات اچانک چھاپہ مار کر اس گروہ کے افراد میں سے بیشتر کو مختلف مقامات سے گرفتار کر لیا گیا۔ پوچھ گچھ کے دوران علم ہوا کہ وہ سب ہندوستان میں تربیت حاصل کر کے آئے تھے۔ زیادہ تر کالج کے لڑکے اس گروہ میں شامل تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری سے حالات معمول پر آ گئے اور شہری زندگی بحال ہو گئی۔ جتنا بھی اسلحہ بارود پکڑا گیا وہ سب ہندوستانی ساخت کا تھا، جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوستان تخریب کاروں کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ مگر اقوام عالم کے ضمیر میں احساس کی ایک رمق تک نہ پیدا ہوئی۔ اس کے برعکس بنگال بے گھر لوگوں کے بارے میں ہندوستان کے بے بنیاد اور شرانگیز پروپیگنڈہ سے متاثر ہوتی رہیں۔

اس مہینے میں ہندوستان کا توپ خانہ بہت سرگرم ہو گیا، اور وہ دن رات بیگناہ شہریوں کو اپنی ہوس ملک گیری اور پاکستان دشمنی کا نشانہ بناتا رہا۔ اگست کے مہینے میں ہمارے توپخانے نے بھی جوابی کارروائی کی جس پر ہندوستان نے واویلا بپا کر دیا۔ اگست اور ستمبر کے مہینوں میں ڈھاکہ شہر بالکل پرسکون ہو گیا اور مشرقی پاکستان پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔

ماہ ستمبر کے آخری ہفتے میں اچانک ہماری رجمنٹ کو کوچ کا حکم ملا۔ صرف چھ گھنٹوں
میں تمام تیاریاں کر کے ہم اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ ہمیں سلہٹ جانا
تھا۔ ڈھاکہ سے نارائن گنج گئے جو ڈھاکہ سے تقریباً بیس میل دور ہے۔ وہاں سے دو چھوٹے
بحری جہازوں کے ذریعے سلہٹ کے لئے روانہ ہوئے چونکہ جہاز کچھ مقامات پر بالکل
کنارے کے ساتھ سے گزرتے تھے اور تخریب کاروں کے حملوں کا ہر جگہ خطرہ موجود تھا،
اس لئے ہمارے جہازوں کی نگرانی کے لئے پاکستان نیوی کی ایک گن بوٹ ہماری حفاظت
کے لئے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دریا میں پانی کم ہونے کی وجہ سے صرف دن میں ہی سفر کیا جا
سکتا تھا ورنہ جہاز کے کم گہرے پانی میں دلدل میں پھنس جانے کا خطرہ تھا۔

دن بھر کے سفر کے بعد ہم بھیراب بازار پہنچے، اور پہلی رات وہیں قیام کیا۔ بھیراب
بازار دریائے میگھنا کے دائیں کنارے پر واقع ایک مشہور تجارتی شہر ہے یہاں پر
دریائے میگھنا پر ایک عظیم الشان پل بھی تھا، جسے جنگ کے دوران اڑا دیا گیا تھا یہ پل
ڈھاکہ اور کومیلا کو بذریعہ ریل گاڑی ملاتا تھا۔ ہنگاموں کی وجہ سے بھیراب بازار کو بھی
بہت نقصان پہنچا تھا۔ مکتی باہنی نے اس علاقے پر قابض رہنے کی سر توڑ کوششیں
کی تھیں مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

دوسرے دن ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک چھوٹے سے گاؤں
کے قریب ٹھہرے اور تیسرے دن دوپہر تک شہر پور گھاٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے
سڑک کے ذریعے سلہٹ گئے۔ وہاں سے مزید احکامات حاصل کرنے کے بعد اپنے
محاذ کو روانہ ہو گئے جو تقریباً چالیس میل دور تھا۔ اسی رات کو محاذ پر پہنچ گئے اور
دشمن سے نمٹنے کے لئے تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

سلہٹ سیکٹر —— جنگِ دسمبر سے پہلے

جس دن سلہٹ پہنچے تھے اسی رات کو بارہ بجے رات سے پہلے ہم اپنے
اوپریشنل ایریا میں پہنچ گئے۔ وہاں پر پنجاب کی ایک رجمنٹ، ٹوچی سکاؤٹس
اور خیبر سکاؤٹس کی کچھ نفری پہلے سے موجود تھی۔ رات کو پنجاب رجمنٹ کے کیپٹن
بشارت اور لیفٹیننٹ افضال کے ساتھ قیام کیا۔ دوسرے دن صبح سویرے اپنے
ذمہ داری کے علاقے کی چھان بین کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ہمیں
UNCONVENTIONAL WARFARE کے لئے تیار ہونا ہے۔ ایک
ایک کمپنی میلوں تک کے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب کہ ایک کمپنی زیادہ سے
زیادہ ڈیڑھ ہزار گز کے علاقے میں ڈیپلائے کی جا سکتی ہے۔ اس طرح ہماری
توپخانہ بیٹری کی توپیں جو کہ عام قاعدے کے مطابق ایک ہی جگہ نصب ہوتی ہیں
وہ ہمیں تین مختلف جگہوں پر نصب کرنی تھیں۔ اس سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں
ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو جنگ کا تھوڑا بہت علم رکھتے ہوں۔ چونکہ
ہمیں اپنی مجبوریوں کا اور دشمن کے عزائم کا علم تھا، اس لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں
کو بروئے کار لاتے ہوئے اس چیلنج کا مقابلہ کیا اور اپنے فرائض کی ادائیگی کیلئے
مصروف عمل ہو گئے۔

یہاں اگر میں محب وطن پاکستانی شہریوں کا ذکر نہ کروں تو یہ زیادتی
ہوگی۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے مشرقی پاکستان میں بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور طغیانی

علاقہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر علاقہ کٹا ہوا ہے۔ سلسلہ حمل و نقل کا زیادہ تر انحصار دریائی راستوں پر ہے اس کے علاوہ جو سڑکیں اور ریلوے لائنیں ہیں ان پر متعدد چھوٹے اور بڑے پل ہیں۔ تخریب کاروں کی زیادہ تر کوشش ان پلوں کو تباہ کرنے کی ہوتی تھیں۔ ہماری افواج مشرقی پاکستان میں اتنی تعداد میں نہیں تھیں کہ پلوں کی حفاظت کیلئے بھی انہیں تعینات کیا جا سکتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے محب وطن لوگ آگے بڑھے۔ اُن میں بنگالی اور غیر بنگالی، سب ہی شامل تھے۔ جس ولولے، جوش اور ذوق و شوق سے اُن لوگوں نے اس ذمہ داری کو سنبھالا وہ نہ صرف قابل تعریف تھا بلکہ ہماری تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ جوانوں اور بوڑھوں نے اپنے آرام سے بے پرواہ اور شرپسندوں کا مسلسل نشانہ بننے کے باوجود اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ جب بھی ان لوگوں سے ملا، ان کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھی اور ایک نیا عزم دیکھا۔ ایسا عزم صرف زندہ قوموں کی ہی میراث ہوتا ہے۔ یوں تو سلہٹ سیکٹر میں شرپسندوں کے خلاف کافی کارروائیاں کیں مگر چھاتک سے شرپسندوں کو نکالنے کے لئے جو کارروائی کی گئی وہ سب سے زیادہ سنگین اور نمایاں تھی۔

چھاتک سلہٹ سے تقریباً پچاس میل دور شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ شہر تو چھوٹا سا ہے مگر یہاں پر مشرقی پاکستان کی واحد سیمنٹ فیکٹری ہے جو دریائے سُرما کے دائیں کنارے پر اور چھاتک شہر بائیں کنارے پر واقع ہے۔ بین الاقوامی سرحد یہاں سے تقریباً سات میل دور ہے۔ اس فیکٹری کی حفاظت کے لئے سکاؤٹس کے کچھ دستے تعینات تھے۔ بین الاقوامی سرحد کی حفاظت کے لئے بھی سکاؤٹس کے ہی کچھ عناصر متعین کئے گئے تھے۔

۱۵۔ اکتوبر کی رات کو دشمن نے اچانک حملہ کر دیا۔ ہراول دستے کا کام باغی بنگالی کر رہے تھے۔ ہندوستان نے اپنا تیار کردہ مکتی بریگیڈ اس حملے میں جھونک دیا تھا جس کی کمانڈ کرنل عثمانی کر رہا تھا اور ہندوستانی توپ خانے کی ایک پوری رجمنٹ اس

حملے میں باغیوں کی مدد کر رہی تھی۔ حملہ اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ سکاؤٹس کے لئے اسے روکنا ناممکن ہو گیا۔ دشمن نے دریا پار کر کے چھاتک شہر پر قبضہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر ہماری افواج نے جو وہاں پہنچ چکی تھیں، ان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اُن کے منصوبے کا علم بعد میں پکڑے جانے والے شرپسندوں کی زبانی ہوا۔ منصوبے کے مطابق انہیں تقریباً بیس میل آگے تک کے علاقے پر قابض ہونا تھا۔ تاکہ اُسے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے استعمال کیا جائے، اور لوگوں کو بتایا جائے کہ نام نہاد بنگلہ دیش کا وجود سرزمین مشرقی پاکستان پر ہے اس وقت تک نام نہاد بنگلہ دیش کا وجود صرف ہندوستان کی سرزمین پر تھا۔

دشمن کو یہاں سے پیچھے دھکیلنے کے لئے مسلسل تین دن تک معرکے لڑے گئے۔ دشمن کو زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا اور آخر کار منہ کی کھا کر واپس ہندوستانی علاقے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ ہماری طرف بھی خاصا جانی نقصان ہوا، مگر اللہ کے فضل و کرم سے دشمن کو اپنے علاقے سے مار بھگانے میں ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ اس ہزیمت نے دشمن کا مورال اس قدر توڑ دیا تھا کہ اگلے ایک مہینہ تک سلہٹ سیکٹر میں وہ کوئی کارگر کارروائی نہ کر سکا۔

رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوتے ہی دہشت پسند ایک بار پھر سرگرم ہو گئے، مگر کسی جگہ پر حملہ کرنے کی غلطی کرنے پر وہ اب کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھے، کیونکہ وہ ایک بار پہلے ہی چھاتک میں قسمت آزمائی کر چکے تھے۔ اسی عرصے میں ہندوستان کی وزیر اعظم متعدد یورپی ملکوں کا دورہ کر کے عالمی رائے عامہ کو اپنی حمایت میں ہموار کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی، مگر افسوس کہ ہماری طرف سے سفارتی سطح پر کوئی ایسا پروگرام ترتیب نہ دیا جا سکا۔ جس سے ہم ہندوستان کا پیدا کردہ غلط تاثر ختم کر سکتے ایک عام آدمی بھی اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے یہ رائے قائم کرنے کے قابل تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہماری پوزیشن بین الاقوامی سطح پر بہت غلط صورت اختیار کئے ہوئے تھی۔ اس کیلئے صرف اُس وقت کی حکومت کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، بلکہ پوری قوم

اور خاص طور سے سرکردہ سیاسی لیڈروں نے اس معاملے میں مجرمانہ غفلت برتی جس کی وجہ سے ہم دنیا کی بیشتر حق پرست اقوام کی ہمدردیوں سے محروم ہو گئے وقت گزرتا رہا اور مشرقی پاکستان کی سرزمین بے گناہ شہیدوں کے لہو سے رنگین ہوتی گئی۔ کاش اس مقدس لہو کو اس طرح سے رائیگاں نہ جانے دیا جاتا۔

جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء نومبر میں شروع ہو گئی تھی

ہندوستان کے عزائم عیاں تھے۔ ایسی بے اصول قوم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ پاکستان کو ختم کرنے کیلئے اس سنہرے موقع سے فائدہ نہیں اٹھائے گی بہت بڑی حماقت تھی۔ پہلے ہی دن سے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہے۔ اور یہ موقع ملتے ہی بغیر کسی پس و پیش کے وہ حملہ کرے گا۔ اس متوقع حملے سے نبٹنے کے لئے مشرقی پاکستان میں موجود مختصر سی فوج کو جس کا بیشتر حصہ پہلے اندرونی خلفشار اور مداخلت کاروں کی سرکوبی کے سلسلے میں ختم ہو چکا تھا بڑی ہی تدبیر کے ساتھ مختلف جگہ تعینات کر دیا گیا تھا۔ ویسے بھی پورے نو ماہ تک مشرقی پاکستان کے دلدلی علاقے میں رہنے کی وجہ سے لوگوں کی صحت پر بہت برا اثر پڑا تھا، پھر بھی ہر شخص اپنے وطن کی سرزمین کے لئے عظیم سے عظیم تر قربانی دینے کے لئے ہر وقت تیار تھا۔

۲۱ نومبر کو عید کا دن تھا۔ صبح سویرے فوجیوں اور بنگالی شہریوں نے محاذ پر نمازِ عید ادا کی، اور ایک دوسرے کو بغلگیر ہو کر عید مبارک دی۔ بڑے کھانے پر قرب و جوار کے شہریوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے ہر حال میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ ایسی صورت حال میں جب محاذ پر فوج متعین ہو تو ایک دوسرے سے ملاقات کبھی کبھار ہی ہوا کرتی ہے۔ عید کے دن دور دور سے بہت سے افسر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ عید کے دن میرے پاس کیپٹن گوندل، میجر سرور شہید، کیپٹن محمد عالم چوہدری

(ایک بنگالی افسر) اور کیپٹن شنواری موجود تھے۔ دوپہر کو بڑے کھانے پر میجر مہدی حسین چوہدری، کیپٹن سرفراز شہید، کیپٹن ظفر حسین بگل، کرنل ریاض، کیپٹن بخش اور لیفٹیننٹ اشفاق آئے۔ کافی دلچسپ باتیں ہوئیں اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حالات پر بھی تبادلۂ خیالات ہوا۔ پورے علاقے کی صورت حال واضح ہو گئی۔

کھانے کے بعد بیشتر افسر اپنے اپنے ذمہ داری کے علاقے میں واپس چلے گئے میجر سرور شہید اور کیپٹن خورشید عالم چوہدری رات کو تقریباً بارہ بجے تک ساتھ رہے۔ بارہ بجے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میجر نقوی شہید پنجاب رجمنٹ سلہٹ سے میرے پاس تشریف لائے۔ میجر نقوی کی کمپنی بین الاقوامی سرحد پر تعینات تھی۔ وہ چند روز پہلے کسی سرکاری کام کے سلسلے میں سلہٹ گئے تھے اور آج واپس اپنی کمپنی میں جا رہے تھے۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ پھر وہ جانے کے لئے کہنے لگے۔ میں نے کہا "کون جانے پھر کبھی ملنا نصیب بھی ہو یا نہیں" کہنے لگے۔ "ایسی ہماری قسمت کہاں کہ شہادت نصیب ہو"

یہ باتیں ہو رہی تھیں، اور فرشتۂ تقدیر ہمارا مذاق اڑا رہا تھا۔ میجر نقوی چائے پینے پر رضامند ہو گئے۔ کون جانتا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی اور پھر کبھی اکٹھے چائے پینے کا موقع نصیب نہ ہو گا۔ چائے کے دوران زیادہ تر باتیں میری توپوں کے فائر کے بارے میں ہوئیں، کیونکہ میری بیٹری ان کی مدد کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ تقریباً رات ایک بجے میجر نقوی شہید مجھ سے رخصت ہو کر اپنے علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔ رات دو بجے کا عمل ہو گا میرے فیلڈ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ٹیلیفون کو کان سے لگایا تو فوراً سمجھ گیا کہ میجر نقوی کا اردلی سپاہی غلام حسین ٹیلیفون پر زور زور سے بول رہا ہے۔ میں نے غلام حسین سے بات کی تو پتہ چلا کہ دشمن نے کمپنی ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر دیا تھا۔ میں کچھ مزید باتیں صورتِ حال کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ٹیلیفون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ غالباً ٹیلیفون کا تار توپ خانے کی گولہ باری سے کٹ گیا تھا۔ بہر حال یہ خبر میں

نے فوراً کرنل ریاض کو دی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ فوراً صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے آگے چلا جاؤں اور یہ کہا کہ میجر چوہدری کی کمانڈ میں ایک کمپنی جا رہی ہے۔

میری گولہ باری، دشمن کی پسپائی

میجر نقوی کا کمپنی ہیڈ کوارٹر انگرام میں تھا۔ یہ مقام میری گن پوزیشن سے تقریباً سترہ میل دور تھا۔ چونکہ میری بیٹری میدانی توپوں پر مشتمل تھی، اس لئے اس گن پوزیشن سے امدادی گولہ باری دینا نا ممکن تھا۔ مجھے تقریباً بارہ میل آگے جانا پڑا۔ ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تمام تیاریاں پہلے ہی مکمل کر رکھی تھیں پہلے ہی دن سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ جنگ کی صورت میں UNCONVENTIONAL جنگ لڑنا پڑے گی۔ پہلے سے تیار کی ہوئی گن پوزیشن پر میں تقریباً پونے تین بجے اپنی دو توپوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ مشکل یہ تھی کہ میجر نقوی کی کمپنی کے ساتھ کسی بھی قسم کا رابطہ نہیں تھا اس لئے انہیں یہ امدادی گولہ باری نہیں دی جا سکتی تھی۔ مجھے اتنا علم میجر صاحب کے اردلی کی زبانی ہو گیا تھا کہ دشمن نے کمپنی ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے کمپنی ہیڈ کوارٹر پر گولہ باری شروع کر دی جو دشمن کے لئے کافی جان لیوا ثابت ہوئی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ہندوستان کی زبانی بھی اس کی تصدیق ہوئی تھی۔

صبح پانچ بجے ہم جوابی حملے کے لئے تیار تھے۔ ایک کمپنی سے حملہ کرنا تھا جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا ایک حصے کی کمان میجر سرور شہید کر رہے تھے اور دوسرے حصے کی کمان میجر چوہدری کے ہاتھ میں تھی۔ میری بیٹری کی دو گنیں چھاتک کی طرف لگی ہوئی تھیں، جو وہاں سے تقریباً ساٹھ میل دور تھا۔ ان گنوں کی کمان کیپٹن سرفراز احمد شہید کر رہے تھے۔ انہیں بھی حکم دے دیا گیا کہ وہ اپنی دو گنیں لے کر انگرام کی طرف آجائیں۔ جوابی حملے میں جانے کے لئے کمپنی کے پاس کوئی آبزرور نہیں تھا۔ اس لئے میجر چوہدری نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ بحیثیت آبزرور چلوں اور جب کیپٹن سرفراز شہید آ جائیں گے تو وہ گن پوزیشن آفیسر کے فرائض میری

جگہ انجام دیں گے۔ میں نے وقتی طور پر دو گنوں کے فائر کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری اپنے اسسٹنٹ گن پوزیشن آفیسر کو سونپی اور خود جوابی حملے کے لئے بحیثیت آبزرور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

تقریباً سوا پانچ بجے ہمارے دستوں نے پیش قدمی کی۔ ابھی ہم تقریباً تین میل ہی چلے ہوں گے کہ ہمارے ہراول دستے جس کی کمان میجر سرور شہید کر رہے تھے، کا دشمن سے تصادم ہو گیا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں میجر چوہدری کے ساتھ ایک پل پہ بیٹھا دوربین سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا کہ دائیں طرف سے مجھے کچھ لوگ حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ غور سے مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ دشمن کچھ اور ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے فوراً فائر کے احکامات وائرلیس پر دیئے چند ہی سیکنڈ بعد گولہ باری شروع ہو گئی جس کی وجہ سے دشمن بجائے بڑھنے کے پیچھے ہٹنا شروع ہو گیا۔ ابھی دائیں طرف سے دشمن کو اچھی طرح سے صاف نہ کر پایا تھا کہ میجر چودھری نے بتایا کہ بائیں طرف سے دشمن کے کچھ عناصر ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں نے فوراً دوسری گنوں جو کیپٹن سرفراز شہید چھاتک سے لائے تھے کا فائر بائیں طرف منتقل کر دیا۔ گولہ باری اتنی مؤثر تھی کہ دشمن کو پیچھے ہٹتے ہی بن پڑی۔ اس دوران دشمن نے میجر سرور شہید کے دستے پر گولہ باری شروع کر دی۔ کھلے علاقے میں ہونے کی وجہ سے زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر اللہ کے فضل و کرم سے دشمن کی پیش قدمی روک دی گئی تھی۔

دشمن کی گولہ باری
ہمارا ایمونیشن پھٹ گیا

دن کے تقریباً نو بجے جنرل آفیسر کمانڈنگ اور دیگر اعلیٰ فوجی افسر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے اگلے مورچوں میں آئے۔ اگلے مورچوں میں عام لوگ بھی کھڑے تھے اور تبادلہ خیال کرنے میں مصروف تھے کہ دشمن کی گولہ باری شروع ہو گئی جو اتفاق

سے بالکل مؤثر نہ تھی۔ تمام گولے ہمارے اوپر سے گزرتے ہوئے تین چار سو گز دور بائیں طرف پھٹ رہے تھے۔ ہماری دائیں طرف بین الاقوامی سرحد کافی نزدیک تھی جہاں دشمن نے اپنا توپ خانہ لگایا ہوا تھا۔ ہندوستانیوں کے پاس گن پوزیشن معلوم کرنے کے لئے تمام ضروری آلات اور انتظامات تھے۔ اور ہمارا توپ خانہ کافی دیر سے گولہ باری کر رہا تھا، اس لئے ہندوستانیوں نے اس کا پتہ لگا لیا۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے درمیانی درجے کی توپوں سے گن پوزیشن پر گولہ باری شروع کر دی۔ یہاں بھی تمام گولے اوپر سے ہوتے ہوئے کافی آگے جا کر پھٹ رہے تھے۔ بدقسمتی سے ایک گولہ پہاڑی کے ایک درخت سے ٹکرا گیا اور ہوا میں پھٹ گیا۔ اس کے کچھ ٹکڑے نیچے پڑے ہوئے ایمونیشن کو لگے اور ایمونیشن پھٹ گیا۔ وہاں پر زبردست تباہی پھیلی۔ اس سے کیپٹن سرفراز احمد شہید ستارۂ جرأت شہید ہو گئے ان کے علاوہ ایک حوالدار اور چار جوان شہید ہوئے اور میرا صوبیدار زخمی تھا۔ یہ اطلاع جب مجھے ملی تو بہت دکھ ہوا۔ مگر جب مقصد کا تصور کیا تو مجھ میں ایک نیا عزم اور نیا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ کیپٹن سرفراز شہید ستارۂ جرأت اور دوسرے شہیدوں کے جسدِ خاکی وہاں سے سلہٹ لے جائے گئے۔ جہاں انہیں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔ افسوس کہ جنگی مصروفیت کی وجہ سے میں شہیدوں کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ وہ جو کچھ دیر پہلے تک یہاں دشمن کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹے ہوئے اور اپنے آپ سے بے خبر وطن کی سرزمین کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے کفن بردوش تھے، ہم سے زیادہ خوش بخت تھے کہ شہادت جیسے بلند رتبے سے سرفراز ہوئے۔ وہ ہم میں موجود تھے، موجود ہیں گے۔ مگر ہماری آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔ انکے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اور واقعات ایک ایک کر کے سامنے آ رہے تھے۔ دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی، اور مملکتِ خداداد کی تابناکی بڑھانے میں اپنے خون کی رنگینی شامل کرنے کی خواہش مچل رہی تھی۔

اس سیکٹر میں دشمن کی پیش قدمی کو مکمل طور پر روک دیا گیا تھا، اس لئے دو دن کے وقفے کے بعد ۲۵ ، نومبر کو دشمن نے زبردست حملہ کیا جس میں اُسے کامیابی ہوئی۔

دشمن کو واپس دھکیلنے کے لئے میجر سرور شہید کی کمپنی کو حکم ملا۔ میجر سرور شہید نے رات کو تقریباً تین بجے دشمن پر بڑی ہی کامیابی سے حملہ کیا، اور دشمن کو زبردست جانی نقصان پہنچایا رات کو VISIBILITY خراب ہونے کی وجہ سے دشمن کے کچھ عناصر باقی رہ گئے جنہوں نے ہماری کمپنی کے لئے گھات لگائی۔ میجر سرور شہید اسی جگہ شہید ہوئے اور بھی بہت سارے سرفروشانِ اسلام کو رتبۂ شہادت نصیب ہوا۔ ہندوستانیوں کو یہاں بہت بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا، مگر آخری وقت میں کامیاب گھات نے میدانِ جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ اور ہندوستانی جو پیچھے ہٹ رہے تھے وہ پیش قدمی کرنے لگے۔ میجر غلام رسول چوہدری زخمی ہو گئے، پھر بھی گھات سے نکل آئے۔ ان کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ انہیں فوراً سی۔ ایم۔ ایچ ڈھاکہ روانہ کر دیا گیا، اور کمپنی کی کمان کیپٹن بشارت کو دی گئی۔ اس اتفاقیہ کامیابی کے بعد دشمن نے پیش قدمی جاری رکھنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اسے ناکام بنا دیا گیا۔ یہاں پر مجھے پنجاب رجمنٹ کے ایک صوبیدار کا واقعہ یاد آ رہا ہے جسے میں اپنی تاریخ کا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

دریائے سُرما کے دائیں کنارے پر ایک چوکی تھی۔ صوبیدار صاحب کو ایک سیکشن سے کچھ زیادہ افراد پر مشتمل دستہ دے کر وہاں تعینات کیا گیا تھا۔ صوبیدار صاحب نے کس جرأت اور مردانگی سے جامِ شہادت نوش کیا، وہ ایک ہندوستانی افسر کی زبانی ہی سنیئے

ایک ہندوستانی کیپٹن جس کی کمپنی نے اس چوکی پر حملہ کیا تھا نے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد سلہٹ میں بتایا کہ صوبیدار صاحب اس وقت تک اپنے مورچے سے فائر کرتے رہے جب تک کہ ایمونیشن ختم نہ ہو گیا، اس کے بعد ہندوستانی میجر (کمپنی کمانڈر) نے صوبیدار صاحب کو ہتھیار ڈالنے کے لئے للکارا، مگر صوبیدار صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ کچھ دیر کے اصرار کے بعد ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہتھیار ڈالنے پر رضامندی کا اظہار کیا، اور اپنی سٹین گن ہاتھ میں لے کر ہاتھ اوپر کر دیئے جوں ہی ہندوستانی میجر انکے قریب پہنچا، صوبیدار صاحب نے حیرت انگیز برق رفتاری سے پوری طاقت سے سٹین گن کا بٹ ہندوستانی میجر کی کنپٹی پر مارا اور میجر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ساتھ ہی چاروں طرف سے شعلے نکلے اور وہ شہید حق اپنے

محبوبِ حقیقی سے جا ملا۔

کیسی کیسی صورتیں خاک میں پنہاں ہو گئیں۔ اس چوکی پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ مگر محافظوں نے آخری سانس تک اسے بچانے کی کوشش کی۔ ایسی قوم کو اپنے تو شکست دے سکتے ہیں ورنہ غیر کی کیا مجال کہ اس کی طرف غلط نگاہ سے بھی دیکھے جس میں ایسے جوانمرد اور پُر عزم لوگ موجود ہوں۔

مغرب کا حملہ، مشرق کا ردِ عمل

جنگ یوں ہی ہوتی رہی مگر دشمن کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ دشمن ہر طرح کے جدید اسلحہ اور ساز و سامان سے لیس تھا۔ اس کے پاس ہوائی جہازوں ٹینکوں اور توپوں کی کمی نہ تھی۔ ہماری افواج اس تمام ساز و سامان کے ضرورت کی حد تک بھی نہ ہونے کے باوجود برابر مقابلہ کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ کم ہی سننے میں آتا ہے کہ گوشت پوست کے انسانوں نے اتنے عرصے تک کامیابی سے دورِ جدید کے آلاتِ حرب کا مقابلہ بے مائیگی کے عالم میں کیا ہو۔ مگر ہماری مسلح افواج بغیر کسی شکایت کے اس وقت تک جنگ کرتی رہیں جب تک انہیں جنگ بند کرنے کا حکم نہ دے دیا گیا۔ ۱۹۷۱ کی جنگ کے بارے میں میں تفصیل سے کچھ عرض کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ اس مختصر سی روئیداد میں اس پر سیر حاصل بحث نہیں کی جا سکتی۔

۳ دسمبر کو جب مغربی محاذ پر جنگ چھڑی تو مشرقی محاذ پر لڑنے والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اس دن لوگوں کی جذباتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے اپنی جنگی ڈائری، جو میں یہاں ساتھ نہیں لا سکا میں لکھا تھا۔

WHEN THE WAR BROKE OUT ON WESTERN FRONT MORALE OF TROOPS ON EASTERN FRONT WENT SKY-HIGH

"جب مغربی محاذ پر جنگ چھڑی تو مشرقی پاکستان میں فوج کا جذبہ اور حوصلہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔"

مگر مغربی محاذ پر جنگ شروع ہونے کے پانچ چھ دن بعد ڈھاکہ ہوائی اڈے کے رن وے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا، جس کی وجہ سے ہماری فضائی طاقت مفلوج ہو گئی اور ہندوستانی فضائیہ کو پوری آزادی مل گئی۔ المختصر ۱۴ دسمبر تک ہمارے دو بریگیڈ ایک مولوی بازار کی طرف سے اور دوسرا اجیتا پور چھ کھائی کی طرف سے پیچھے ہٹتے ہوئے سلہٹ میں پہنچ چکے تھے۔ دشمن نے سلہٹ شہر میں چھاپہ ماروں (کمانڈوز) کی ایک پوری بٹالین کو داخل کر رکھا تھا۔ یہ بٹالین دریائے سرما کے دائیں کنارے میں تعمیراتی علاقے میں اتاری گئی تھی۔ ایک دو بار اسے وہاں سے نکالنے کی کوشش کی گئی، مگر مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کی وجہ یہ مکانوں وغیرہ کی بستی تھی جسے فوجی زبان میں BUILT-UP-AREA کہتے ہیں۔ ایسی جگہ سے چھاپہ ماروں کو ہٹانا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ دو بریگیڈ سلہٹ شہر سے باہر ایئرپورٹ کی طرف چائے کے باغات میں لگا دیئے گئے۔ یہ پالیسی کیوں اختیار کی گئی؟ سلہٹ شہر میں دو بریگیڈوں کو کیوں اکٹھا کیا گیا؟ اس سے مجھے کوئی بحث نہیں، کیونکہ یہ میرا موضوع نہیں۔

بالائی ہیڈ کوارٹروں سے ہمیں "آخری گولی آخری جوان" کے اصول اور عزم سے لڑتے کے پیغامات موصول ہوا کرتے تھے۔ سلہٹ میں صورت حال کچھ اس طرح سے تھی کہ چاروں طرف دشمن تھا اور چائے کے باغات میں ہم نے مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ ہر شخص حالات کے پیش نظر آخری دم تک لڑنے اور مرنے کا عزم کئے ہوئے تھا۔ حالات کچھ سازگار نہ تھے۔ توپوں کا ایمونیشن ختم ہونے کو تھا، اور دشمن کی کامیابی کے ساتھ ساتھ خود غرض اور موقع پرست بنگالی ہندوستانیوں سے مل گئے تھے۔

سقوطِ ڈھاکہ کا حادثہ

یوں تو خاصے عرصے سے ہندوستانیوں نے ریڈیو پر پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا

کہ مشرقی پاکستان سے ہماری افواج کا بچ کر نکلنا کسی صورت میں ممکن نہیں اور یہ بھی حقیقت
سمندری اور ہوائی راستے مسدود کر دیئے گئے تھے، اور ہمارا تعلق دنیا سے کٹ چکا تھا۔ خشکی
کے راستے بھی مسدود ہی تھے۔ ان حقائق کے باوجود کبھی تصور بھی نہیں کیا گیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے
کے احکامات بھی صادر کئے جا سکتے ہیں۔ ریڈیو پر بانگ شاہ کی پیشکش کا ہم ہمیشہ مذاق اُڑایا کرتے
تھے، اور اسے ہندوستانیوں کی ایک جنگی چال سمجھتے تھے۔ دوسرے ہمارے اس عزم کو جنرل
نیازی کے اس بیان سے جو انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ سے چند ہی گھنٹے پہلے اخباری نمائندوں کو
دیا تھا۔ بڑی تقویت پہنچی تھی۔

۱۶ دسمبر کی صبح کو ہندوستانی ریڈیو سے سقوط ڈھاکہ کی خبر سنی مگر درخور اعتنا نہ سمجھا۔ بی بی سی
نے بھی اپنی خبروں میں یہ خبر نشر کی مگر یقین نہ کیا۔ سلہٹ میں ۱۶ دسمبر کے روز بھی جنگ جاری رہی اور
۱۷ دسمبر کی رات کو بھی جنگ ہوتی رہی جبکہ ۱۶ دسمبر کی صبح جنرل نیازی سقوط ڈھاکہ کی دستاویزات
پر دستخط کر چکے تھے۔ ۱۶ دسمبر کو جنرل یحییٰ خان نے ریڈیو سے جو تقریر کی۔ اس سے یہ اندازہ
ہوا کہ جنگ جاری رہے گی۔ جوانوں اور افسروں نے یہ خبر سنی تو فرطِ جذبات سے نعرے
لگانے لگے۔

۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ میں اپنی کمانڈ پوسٹ میں بیٹھا ہوا
تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اٹھایا۔ میرا بیٹری کمانڈر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے بول
رہا تھا۔ اس نے یہ منحوس خبر سنائی کہ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اپنی زیر کمان
تمام مسلح افواج کو ہندوستانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ
صبح سویرے ایسا بیہودہ مذاق کیوں کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: "میں بالکل سنجیدہ ہوں،
اور تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ رات کو ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے وائرلیس پر رابطہ قائم ہوا۔ انہوں نے
یہ پیغام دیا ہے اور ہمارے مقامی کمانڈر ہندوستانی کمانڈر سے رات کو مل کر ہتھیار ڈالنے
کے بارے میں طے کر چکے ہیں۔" اور پھر انہوں نے مجھے بتایا "آج دوپہر تک سلہٹ کالج میں جمع
ہونا ہے اور تمام لوگوں، ہتھیاروں اور دیگر سامان کی فہرستیں تیار ہونی چاہئیں تاکہ ہندوستانی
فوجیوں کو سامان دینے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

یقین کیجئے مجھے دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی، اور میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ میرے جوانوں نے
مجھ سے اس افسردگی کی وجہ پوچھنا چاہی! انہیں کس منہ سے یہ خبر سناتا۔ چپ رہا۔ تھوڑی دیر
بعد کیپٹن ظفر حسین گل (راولپنڈی) گن پوزیشن پر آگئے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی آنکھوں میں آنسو
جھلملانے لگے، اور باوجود کوشش کے کوئی بات نہ کر سکے۔ بس پانی کا ایک سمندر تھا جو سیلاب
کی طرح آنکھوں سے جاری تھا۔ جب کچھ پانی بہہ چکا تو اپنے آپ کو قابو میں کیا۔ یہ خبر زیادہ
دیر تک جوانوں سے پوشیدہ نہ رکھی جا سکی۔ جوں ہی جوانوں کو اس کا علم ہوا وہ سیدھے
میرے پاس پہنچے۔ ان کے چہروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ میرے منہ سے یہ سننے کے
لئے بے قرار تھے کہ یہ خبر جھوٹی ہے۔ مگر حقیقت کو کہاں تک چھپایا جا سکتا تھا۔ میں نے انہیں

مطمئن کرنے کی بڑی کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہ دیا اور آنکھیں بھی غم و اندوہ کے سمندر
کو زیادہ دیر تک چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ میں آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کر
رہا تھا۔ میرے آنسوؤں نے مجھ سے استفسار کرنے والوں پر حقیقت عیاں کر دی تھی، اور پھر
جدھر بھی میں نے نگاہ دوڑائی مجھے اشکبار آنکھوں اور درد و الم سے بجھے ہوئے اداس چہروں
کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ہر طرف شامِ غریباں کا منظر تھا۔ ماحول پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ سلہٹ
کا علاقہ جو جنت نظر آتا تھا، کہیں چائے کے باغات تھے تو کہیں روح پرور کیلے اور سپاری
کے درختوں کا سبزہ زار تھا، اب اس علاقہ پر موت کی پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔

بنگالی بھی روتے

ہماری مسلح افواج کے بیشتر بنگالی افسر اور جوان آخری دم تک ہمارے ساتھ دشمن
کے خلاف سینہ سپر رہے۔ انہوں نے دشمن کے ناپاک قدموں کو اس سرزمین کی طرف بڑھنے
سے روکنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ مگر رب العزت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہم مسلمانوں
میں اس قدر نا اتفاقی اور انتشار پیدا ہو چکا تھا کہ اس ہزیمت کے سوا اس کی کوئی سزا ہو
ہی نہیں سکتی تھی۔ خدا کے قوانین بدلتے نہیں اور ہر عمل کے نتائج پیدا ہو کر ہی رہتے

ہیں۔

جب بنگالی جوانوں اور افسروں نے یہ منحوس خبر سنی تو بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ صدمہ ہی ایسا تھا جس سے ہماری روحیں تک متاثر ہو گئی تھیں۔ بنگالی افسروں اور جوانوں کا اصرار تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں ہمارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اب ہمارے ساتھ ہی پاکستان جائیں گے۔ ہمیں یہ علم تھا کہ ہندوستانی بنگالیوں کو ہر حال میں مکتی باہنی کے حوالے کر دیں گے۔ مکتی باہنی نے انہیں جس اذیت اور بربریت کا تختہ مشق بنانا تھا، اس کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا۔ ہم نے اپنے بنگالی ساتھیوں کو وہیں رہنے پر قائل کر لیا کیونکہ وہاں رہ کر وہ بہت کچھ کر سکتے تھے۔ اس جگہ سے ان کا مستقبل وابستہ تھا۔ انشاء اللہ یہی محب وطن بنگالی اس سرزمینِ اسلام کو منافقین اور منکرین کے قبضے سے چھڑانے میں کامیاب ہوں گے۔ انشاء اللہ ایسا ہو کر رہے گا۔ ہندو کے عزائم زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتے اور عزائم عیاں ہوتے ہی ہندو کے لئے اس سرزمین پر مسلط رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

نام نہاد بنگلہ دیش کے حالات کے بارے میں بین الاقوامی پریس اور ریڈیو کے توسط سے جو خبریں موصول ہوتی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ دن بدن حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ ہندوستان کی طرف سے استحصال ہے۔ آج اس خطے کے مسلمان ہندو کے دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ ہندو جو تقسیم ہند کے بعد ہندوستان چلے گئے تھے وہ موجودہ خودغرض لیڈروں کے ایما پر واپس آ رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ہندو کا وہ اثر و رسوخ جو تقسیم سے پہلے اس خطے پر تھا اس کو بحال کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ بین الاقوامی سازش کے تحت ہو رہا ہے تاکہ مسلمانوں کو ثانوی حیثیت دے دیں اور وہ اس قابل نہ رہیں کہ ملکی یا بین الاقوامی سیاست میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ مگر اب آہستہ آہستہ جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے کھڑی کی ہوئی دیواریں منہدم ہو رہی ہیں۔ ہمارے بنگالی بھائیوں کے اذہان پروپیگنڈے کے جادو سے چھٹکارا پا چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے دوست اور دشمن کو پہچاننا شروع کر دیا ہے ان پر یہ حقیقت کھل چکی ہے کہ انہیں تباہ و برباد کرنے والا کون تھا۔ وہ اب بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی میں جب کوئی قوم اجتماعی طور پر کوئی غلطی کرے تو اس کا خمیازہ لمبے عرصے

تک بھگتنا پڑتا ہے۔ خدا کے حضور یہ میری مخلصانہ دعا ہے کہ ہمارے ان بدقسمت بھائیوں کی مصیبتوں کو جلد از جلد رفع فرمائے اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چلنے کی پھر سے توفیق عطا فرمائے، کیونکہ اس میں ہماری اور عالم اسلام کی فلاح ہے ورنہ ہماری نااتفاقیوں اور اندرونی خلفشار سے غیر ہمیشہ کی طرح فائدہ اٹھاتے رہیں گے[1]

میں نے اور کیپٹن ظفر شین گل نے مشرقی پاکستان سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا مگر جب بھی فرار ہونے کا میں سوچتا تو عجیب سا محسوس ہوتا۔ میں سوچا کرتا، کیا یہ اچھا لگے گا کہ میں اپنے دوش بدوش لڑنے والے افسروں اور جوانوں کو ہندوستانیوں کے سامنے ہتھیار ڈلوا کر خود فرار ہو جاؤں؟ —— یہ ناممکن تھا کہ میں سب کو ساتھ لے کر فرار ہو جاتا۔ ہندوستانی افواج اور مکتی باہنی نے ہمیں ہر طرف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ علاوہ ازیں دیہی علاقوں میں بھی مکتی باہنی کے غنڈے من مانی کرتے پھر رہے تھے جس کی وجہ سے فرار ناممکن تھا۔ ان تمام حقائق اور مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے برعکس ہندوستان پہنچنے کے بعد ریل گاڑی یا کیمپ سے فرار ہونے کی کوشش کی جائے گی۔

---

[1] مصنف نے یہ روئیداد شیخ مجیب کے دورِ حکومت میں لکھی تھی۔ مصنف نے مشرقی پاکستان کے اُس وقت کے احوال و کوائف دیکھ کر جو پیش گوئی کی ہے وہ پوری ہو چکی ہے۔ مجیب کو بھارت نوازی اور ملک کی تباہی کے جرم میں محب وطن بنگالی افسروں نے گولی مار دی اور ملک کو بھارتی استبداد سے نجات دلا دی ہے اور ان تمام بنگالیوں کو جنہیں پاکستان سے محبت کے اظہار کی پاداش میں جیلوں میں ڈالا گیا تھا رہا کر دیا گیا ہے۔ (ناشر)

اب ہم قیدی تھے

ابھی ہم بیٹھے گفتگو کر ہی رہے تھے کہ میرا بریگیڈ کمانڈر آ گیا۔ اس نے ہمیں تمام تر تفصیلات سے آگاہ کیا، اور کہا کہ تمام جوانوں، ہتھیاروں اور ساز و سامان کی تفصیلات کے ساتھ دوپہر تک ماڈل سکول پہنچ جائیں۔ یہ سکول سلہٹ شہر سے تقریباً چار میل دور ایئرپورٹ روڈ پر واقع تھا۔ اس وقت تک ہندوستانی اعلیٰ فوجی افسروں اور دیگر سٹاف افسروں نے ہمارے علاقوں میں آنا شروع کر دیا تھا۔ ٹریننگ کے دوران ہر سپاہی کو سکھایا جاتا ہے کہ ہتھیار ڈالنا ناگزیر ہو جائے تو اپنے تمام ہتھیاروں اور سامان کو تباہ کر دو۔ ہندوستانیوں کی ہمارے علاقے میں موجودگی اس فرض کو پورا کرنے میں مخل ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے اعلیٰ افسروں سے بات کی مگر کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ آخر کار میں نے نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے توپوں کو جزوی طور پر تباہ کر دیا۔ تمام آٹومیٹک ہتھیار ناکارہ کر دیئے۔ تمام ایسے کاغذات جن سے دشمن کو کوئی راز معلوم ہو سکتا تھا، میں نے جلوا دیئے مجھ سے جو بن پڑا میں نے کیا۔ قارئین کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایک سپاہی کے دل میں اپنے ہتھیار کی کس قدر عزت ہوتی ہے۔ اور وہ اس سے کتنا پیار کرتا ہے۔ سپاہی کے لئے ہتھیار جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ توپخانے میں اپنے ذاتی ہتھیاروں کے علاوہ توپیں بھی ہوتی ہیں۔ توپچی توپوں کو اپنے ملک و ملت کی عزت و اقبال اور اپنے ذاتی وقار کی نشانی سمجھتے ہیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ جب وہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی توپوں کو تباہ کر رہے تھے، تو ان کے دلوں پہ کیا گزری ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ

——— اک قیامت تھی جو گزر گئی۔

دوپہر کو میں اپنے تمام جوانوں اور ساز و سامان کے ساتھ ماڈل سکول پہنچا۔ ہندوستانی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ پاک افواج کے لوگ بھی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ غیر متوقع طور پہ ہندوستانیوں

کا برتاؤ برا نہ تھا۔ اپنے آدمیوں اور سامان کو مقرر کی ہوئی جگہ پہ پہنچایا۔ وہاں چند ایک پاکستانی افسر کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی ہم کھڑے کچھ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ چند ایک ہندوستانی نوجوان افسر آ گئے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ تھوڑی دیر میں ہندوستانی سپاہیوں کی ایک پارٹی آئی جو ہتھیار اور سامان اکٹھا کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ جب اپنی توپیں ہمارے جوانوں نے ہندوستانیوں کے حوالے کیں تو ان کے آنسو نکل آئے۔ بعض کی تو ہچکی بندھ گئی۔ منظر اس قدر رقت آمیز تھا کہ وہاں اپنے جو افسر کھڑے تھے ضبط نہ کر سکے، اور وہاں سے دوسری طرف چلے گئے مگر کسی طرف چین نہیں تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ایسی ذلت کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا مگر اپنوں ہی کے ہاتھوں لائی ہوئی ذلت کی محسوس شکل میرے سامنے تھی۔

شام تک سلہٹ سیکٹر میں موجود ہماری فوج نے ہتھیار ہندوستانی فوج کے حوالے کر دیئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بعض مقامات پہ عام لوگوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی رسم ادا کی گئی۔ خوش قسمتی سے سلہٹ سیکٹر میں ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ سہ پہر کو ہندوستانی فوج کا بریگیڈیئر کومین آیا۔ اس نے مختصر سی تقریر میں کہا۔

ہم سب سپاہی ہیں۔ ہماری آپس میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہمیں جب ہتھیار اٹھانے کا حکم ملتا ہے تو ہم لڑتے ہیں، اور جنگ بندی کا حکم ملتا ہے تو حکم بجا لاتے ہیں۔ میں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں آپ کسی طرح کسی بھی لحاظ سے دنیا کی کسی فوج سے کم نہیں مگر جن حالات کے تحت اور جن مشکلات میں آپ لڑ رہے تھے، اس کا یہ نتیجہ نکلنا بعید از قیاس نہیں تھا۔ اب آپ جلد اپنے گھروں کو جائیں گے، اور اپنے رشتہ داروں سے ملیں گے۔ جب تک آپ ہمارے پاس ہیں ہم آپ کی دیکھ بھال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔"

شام تک یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ مغربی محاذ پر بھی جنگ بندی ہو گئی ہے اور یحییٰ خاں نے مسٹر بھٹو کو اقتدار سونپ دیا ہے۔ رات کو مسٹر بھٹو کی پہلی نشری تقریر سنی۔ ملک کے حالات کی سنگینی کا علم ہوا۔ سب کے دل سے ملک کے استحکام اور تحفظ کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ بڑے بھیانک اور ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ نہ جانے کتنی بار آنکھ کھلی اور آنسو جاری ہوئے۔ اسی کشمکش میں صبح ہو گئی۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور اپنی

بدقسمتی پر آنسو بہاتے تھے۔

دوسرے دن یعنی ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح میں نیچے گیا، تو میری ملاقات میجر خٹک سے ہوئی۔ میجر خٹک پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں میرے ویپن انسٹرکٹر رہ چکے تھے۔ اگر ہم نارمل حالات میں ملتے تو ہم دونوں بہت ہی خوش ہوتے مگر ہم ایک دوسرے سے اپنے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میجر خٹک مجھے سکول کے اس حصے میں لے گئے جہاں میری بیٹری کے جوان تھے۔ وہیں سکول کے برآمدے میں کرسیاں ڈال کر ہم دونوں بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ہمارے کچھ اور افسر آگئے۔ تھوڑی دیر بعد ہندوستانی فوج کا کرنل بھاٹیہ اور پانچ چھ دوسرے ہندوستانی افسر بھی وہاں آگئے۔ ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ کرنل بھاٹیہ کے ساتھ کچھ بنگالی افسر بھی آئے تھے۔ ان کا بھی تعارف ہم سے کرایا گیا۔ ان میں سے دو کا پاک فضائیہ سے تعلق تھا وہ مفرور ہو کر ہندوستان چلے گئے تھے۔ یہ دونوں اپنے فرار کا یعنی بھگوڑے ہونے کا قصہ بڑے فخر سے سنانے لگے۔ ہمارے ایک افسر نے ان سے کہا آپ لوگوں کو شرم آنا چاہیئے کہ اپنے حلف کا پاس نہ کرتے ہوئے فرار ہو کر دشمن سے مل گئے اور پھر اسی ملک کے خلاف جس نے آپ کو تربیت دے کر افسر بنایا اس کے خلاف لڑتے۔

ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ پھر بھی کہنے لگے کہ آپ لوگوں نے ہمارے لوگوں کا استحصال کیا ہے اور اسے لوٹتے رہے ہیں۔ پاک فوج کے ایک میجر کو سخت غصہ آگیا۔ طیش میں آکر کہنے لگا یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کس نے کس کا استحصال کیا ہے اور وقت کبھی لوٹ کر نہیں آیا کرتا۔ بات کچھ غلط رنگ پکڑنے لگی۔ اس لئے کرنل بھاٹیہ نے مداخلت کی اور کہا کہ آپ لوگوں کو اس طرح سے طیش میں نہیں آنا چاہیئے۔ اس کے بعد کرنل بھاٹیہ سے درخواست کی گئی کہ آئندہ براہِ کرم وہ کسی بنگالی افسر کو ساتھ نہ لائیں۔ کیونکہ اس سے جذبات مشتعل ہونے کا خطرہ ہے جو کوئی اور صورت بھی پیدا کر سکتا ہے۔ کرنل بھاٹیہ نے وعدہ کیا کہ وہ اس پر غور کرے گا۔ اس کے علاوہ یہ بات ہم نے اعلیٰ افسروں تک بھی پہنچا دی۔ ہمارے افسروں نے ہندوستانی افسروں سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ آئندہ بنگالی افسروں کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

قتلِ عام کی ایک اور لہر

پاکستانی مسلح افواج کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد سلہٹ میں موجود غیر بنگالیوں کی جانیں سخت خطرے میں تھیں۔ غیر بنگالیوں کے علاوہ کچھ بنگالی خاندانوں پر بھی علیحدگی پسندوں کا عتاب نازل ہونے کا خطرہ تھا۔ غیر بنگالیوں کی ایک بڑی تعداد نے اسی سکول میں آکر پناہ لی جس میں ہماری مسلح افواج کو رکھا گیا تھا۔ غیر بنگالیوں کو پناہ دینے کے سلسلے میں ہتھیار ڈالنے سے پہلے ہی بات کر لی گئی تھی۔ کچھ بنگالیوں نے جن کا تعلق مجاہد فورس سے تھا کیمپ میں پناہ لی مگر چند روز بعد ہندوستانیوں نے انہیں مکتی باہنی کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ جو غیر بنگالی کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے ان کے بارے میں بہت ہی دل سوز خبریں آرہی تھیں بے گناہ لوگ قتل کیے جا رہے تھے۔ عورتوں کو سرِ عام ذلیل اور بے آبرو اور معصوم بچوں کو کاٹا جا رہا تھا۔ مکتی باہنی کے غنڈوں نے اذیت رسانی کے لئے ایک کمرہ TORTURE CELL بنا رکھا تھا۔ اس کا انکشاف سلہٹ میڈیکل کالج کے ایک پروفیسر نے کیا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے وہاں سے نکل کر کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ گھر پر تھے کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھول کر دیکھا ان کے کچھ شاگرد کھڑے تھے۔ شاگردوں نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ ان کے ساتھ چلے گئے انہیں TORTURE CELL میں لے جایا گیا، جہاں پر انہیں انہی کے شاگردوں نے وہ وہ اذیتیں دیں جو صرف سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ وہ شرمناک سلوک کیا گیا، جو بدترین مجرموں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔

زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے کتنے لوگ خانماں برباد ہوئے ہیں، کتنے اپنے پیاروں سے بچھڑ گئے ہیں، کتنے بچے یتیم ہو گئے ہیں! کتنی سہاگنیں بیوہ ہو گئی ہیں! کتنی ماؤں کے لال ان سے جدا

اور کتنے باپوں کے سہارے ان سے چھین لے گئے ہیں؟ یہ ایک لمبی اور درد بھری داستان ہے جو ایک سانحہ ہے، ایک المیہ ہے۔ ایک قیامت ہے جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔

میں ایک شخصیت کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ سلہٹ سے جنتا پور کی طرف جائیں، تو جنتا پور اور سلہٹ کے تقریباً درمیان سڑک کے بائیں طرف ایک بورڈ نظر آئے گا جس پر KHAN TEA ESTATE لکھا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ اس بورڈ پہ کیا لکھا ہوگا، یہ اسٹیٹ چائے کے وسیع باغات پر مشتمل ہے جو دس بارہ میل وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا مالک ایک معمر پٹھان تھا۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ بدقسمت شخص سلہٹ میں غالباً تقسیم سے پہلے آباد ہوا تھا۔ اسے کیا علم تھا کہ ایک دن اس کے اپنے بھائی اس کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے اور اسے یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی، جس کو اس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں بسا لیا تھا۔ میں جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء سے پہلے یہ چائے کے باغات دیکھنے گیا۔ یہاں ہزاروں مزدور روزانہ کام کرتے تھے اور وہ ہر طرح سے خوش تھے۔ مالک ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک تھا، اور لوگوں کی ہر ممکن مدد کرتا تھا۔ باغات کے علاقے میں ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اس کا بنگلہ نما مکان تھا جس میں زندگی کی ہر ضروری چیز میسر تھی۔ میں جب اس سے ملنے ٹیلے اس کے مکان پر گیا تو وہ گرمجوشی سے ملا اور باہمی دلچسپی کے موضوعات پر کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو اس نے مجھے دوبارہ آنے کی دعوت دی، مگر مصروفیات اتنی بڑھیں کہ دوبارہ جانا ممکن نہ رہا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے چھٹے روز میں ماڈل سکول سلہٹ کے ایک کمرے سے اپنی بیرک کے افراد کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک میری نظر اس معمر شخص پر پڑی جو چند روز پہلے رئیسانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ اس دن وہاں اپنے ہاتھ میں پلیٹ اور مگ پکڑے ہوئے اپنا کھانا لینے جا رہا تھا جو پاک فوج کی طرف سے انہیں دیا جا رہا تھا۔ مگر آفرین ہے اس کی ہمت کو کہ چہرے پر ملال کا شائبہ تک نہ تھا۔ چہرے پر وہی شگفتگی اور وہی تازگی۔ گو اس کا مجھے اچھی طرح سے احساس تھا کہ اس کے دل پر اس وقت کیا بیت رہی ہوگی۔ میرے اصرار کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ اپنے چائے کے باغات سے صرف ایک عدد کپڑے کے جوڑے کے ساتھ جان بچا کر نکلا

ہے، جو اس نے پہن رکھا تھا۔ اسے فوجی کپڑوں کا ایک جوڑا مہیا کر دیا گیا۔ کیونکہ دوسرے کپڑے مہیا کرنا ہمارے بس میں بھی نہ تھا۔ اس کے بعد جب تک ہمیں سلہٹ سے آسام نہ لے جایا گیا، اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

ویسے تو میں سلہٹ میں تین مہینے سے تھا، مگر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد وہاں پندرہ دن تک رہا۔ ہندوستانی فوج نے ماڈل سکول کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہمیں سکول سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جنگ سے پہلے اور جنگ بندی تک اس میں ہمارا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر، اور فوجی ہسپتال تھا۔ چونکہ ۰۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد تمام سلسلۂ حمل و نقل منقطع ہو گیا تھا۔ اس لئے زخمیوں کو سی۔ ایم۔ ایچ ڈھاکہ نہیں بھیجا جا سکا۔ سلہٹ کے سول ہسپتال کا بیشتر عملہ روپوش ہو گیا۔ جو افراد کام پر موجود تھے وہ اس قدر کم تھے کہ اتنے زخمیوں اور مریضوں کو سنبھالنا ان کے بس سے باہر تھا، اس لئے اس چھوٹے سے ہسپتال میں اس کی گنجائش سے کئی گنا زیادہ مریض داخل تھے۔ اتنے مریضوں سے نپٹنے کے لئے ساز و سامان بھی کافی نہ تھا۔ کافی مقدار میں دوائیاں بھی نہیں تھیں۔ چنانچہ صحیح دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی۔ رہی سہی کسر ہندوستانیوں نے ہسپتال پر راکٹ برسا کر پوری کر دی تھی۔ ہسپتال کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ ان حالات اور مجبوریوں کے باوجود ہمارے ڈاکٹروں نے اپنے فرائض کو جس خوش اسلوبی اور جانفشانی سے سرانجام دیا وہ قابلِ قدر تھا۔ خدا اس جذبے کو سلامت رکھے۔

ان پندرہ دنوں میں بہت سے لرزہ خیز واقعات دیکھنے اور سننے میں آئے۔ ان سب کا یہاں تلمبند کرنا ممکن نہیں۔ صرف ایک واقعہ سپردِ قلم کر رہا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ متعصب ذہنیت نے کیسے کیسے درندگی کے مظاہرے کئے تھے۔

مسٹر جمال احمد گورنر منعم خان کی کابینہ میں ایک وزیر ہوا کرتے تھے۔ ان کے بھائی سلہٹ میں مقیم تھے۔ ایک دردمند مسلمان اور سچے پاکستانی کی حیثیت سے انہوں نے ہماری فوج کی ہر طرح کی مدد کی۔ جہاں ضرورت پڑتی وہ پیش پیش نظر آتے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد سلہٹ میں جن خاندانوں پر عوامی لیگ کے غنڈوں کا عتاب نازل ہوا، ان میں ان کا خاندان بھی شامل تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ انکے اہل و عیال کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، مگر خود انکے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا گیا، وہ ہر قلبِ حساس کو رُلا دیتا ہے، مسٹر جمال کو درختوں کے ساتھ باندھ کر

جیسی مختلف سمتوں کو چلائی گئیں، جس سے مسٹر جمال کا جسم دو ٹکڑوں میں کٹ گیا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جسم کس طرح کٹا ہو گا۔

چند روز بعد معتبر ذرائع سے پتہ چلا کہ مسٹر جمال کو قتل کرنے سے پہلے متعدد بار یہ پیش کش کی گئی تھی کہ وہ بنگلہ دیش کی حمایت کا اعلان کریں تو ان کی جان بخشی کی جا سکتی ہے مگر انہوں نے ہر بار اس پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کو کہتے ہیں: اصول پسندی اور پختگی ایمان کہ موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی اپنے اصولوں سے نہ ہٹا جائے اور اپنے ایمان کے خلاف کوئی کام نہ کیا جائے۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اس وقت نام نہاد بنگلہ دیش حکومت کی حمایت کا اعلان کر دیتے اور اس کے بعد اپنے طور پر اس کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔ لیکن جن لوگوں نے ایک بار اصول پسندی کی چاشنی کو چکھ لیا وہ کبھی اس سے دست بردار نہ ہوئے۔ ایسے واقعات کیا ہمیں اسلام کا دورِ اول یاد نہیں دلاتے جب نو مسلموں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کیلئے ہر قسم کی اذیتیں دی جاتی تھیں؟ مگر کفار کسی ایک کو بھی اسلام سے گمراہ نہ کر سکے۔

ہم یہ دعوےٰ تو نہیں کر سکتے کہ دشمن کسی کو بھی زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسٹر جمال جیسے جذبۂ ایمان کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں محبِ وطن بنگالیوں نے موت قبول کر لی، اس بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا جس کا خالق بھارت تھا۔

فرار کے لیے ہندوستانی کرنسی حاصل کر لی

ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک دن چند ہندوستانی نوجوان افسر ہم سے ملنے کے لئے سیل میں آئے۔ وہ ہم سے گلے مل رہے تھے۔ اچانک ایک ہندوستانی سیکنڈ لیفٹیننٹ نے رونا شروع کر دیا۔ ہمارے لئے یہ بات بہت ہی تعجب انگیز تھی۔ اور ہم اس کے رونے کا باعث نہ سمجھ سکے، نہ ہی اس وقت دوسروں کی موجودگی میں پوچھنا مناسب سمجھا۔ اس دن کے بعد اس سیکنڈ لیفٹیننٹ نے تقریباً روزانہ ہمارے پاس آنا شروع کر دیا۔ وہ شہر سے ہمارے لئے ضروریات کی

چیزیں بھی لا کر دے دیا کرتا تھا۔ سلہٹ شہر جانے کے لئے ہم پر پابندی تھی۔ ایک دن ہم نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اُس دن رونے کی کیا وجہ تھی۔ اس نے چاروں طرف احتیاطاً دیکھا اور کہنے لگا: ہم تقسیم ہند سے پہلے جہلم میں رہتے تھے۔ تقسیم کے بعد ہم ہندوستان آ گئے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایسے ماحول میں پایا جس میں انسان کو ذات پات کی بنیاد پر قابلِ عزت و تکریم یا قابلِ تحقیر و تذلیل سمجھا جاتا تھا۔ جب میں ذرا اور سمجھدار ہوا تو پتہ چلا کہ اس ہندو معاشرے میں میرے والدین بھی قابلِ تکریم نہ تھے۔ وہ مجھے جہلم کی پرانی باتیں سناتے تو میں دیر تک سوچتا رہتا کہ اے کاش میرے والدین اس سرزمین سے نقل مکانی نہ کرتے جہاں پر ذات پات اور نسلی امتیاز نہیں تھا.....

"مجھے جب فوج میں کمیشن ملا تو میں سمجھا کہ اب ہمارے دن پھر جائیں گے مگر افسوس کہ میری کمیشن میرے والدین کے لئے ایک نئے دردِ سر کا باعث بن گئی۔ اب سب لوگ میرے والدین کو یہ کہہ کر طعنے دیتے تھے کہ اب تو فلاں کا بھی لڑکا افسر بن گیا ہے۔ بھگوان ہم پر دیا کرے۔ اس دن جب میں آپ سے ملا تو میرے ذہن میں یہ تمام باتیں فلم کی ریل کی طرح چل گئیں۔ اور میں اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ ہندو نے ذات پات کی بنیاد پر کتنے انسانوں کو حقیر بنا کر رکھ دیا ہے۔"

اسیری کے پہلے ہی دن سے میں نے فرار ہونے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔ مگر ایسے لوگ بہت کم تھے۔ جو واقعی سنجیدگی سے فرار ہونے کے لئے سوچ رہے تھے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہمارے بیشتر افسر ہندو کی ذہنیت کو سمجھنے میں ناکام رہے تھے۔ تقریباً پچانوے فیصد لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ زیادہ سے زیادہ دو مہینے کے عرصے میں جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہو جائے گا۔ مگر پہلے ہی دن سے میرا موقف مختلف تھا۔ میں دوسروں کو بتایا کرتا تاکہ تاریخ میں پہلی بار ہم ہندوؤں کے ہاتھوں میں آئے ہیں، جس کا وہ بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے کیونکہ اُنکے گورو چانکیہ کا یہی فرمان ہے۔ اب وقت نے ثابت کر دیا کہ چانکیہ کے چیلوں نے سیاسی سودے بازی کی ہر ادھی کوشش کی مگر ہمارے بلند حوصلہ سپاہیوں اور شہریوں نے ان کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ میں نے تو پہلے ہی دن سے فرار ہونے کا تہیہ کر لیا تھا۔ خواہ ٹرین سے فرار ہونا پڑے یا کیمپ سے اس مقصد

کے لئے میں نے کچھ پاکستانی روپوں کا ہندوستانی روپوں سے، ہندوستانی افسروں کے ذریعے تبادلہ کر لیا۔ میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ فرار کے بعد تیز رفتاری کو برقرار رکھنا سب سے ضروری اور مشکل کام ہوگا۔ اس مقصد کے لئے ہندوستانی کرنسی کا پاس ہونا ضروری تھا۔ مجھے خلافِ توقع ہندوستانی نوٹ بڑی آسانی سے مل گئے۔ میں نے برابر کا سودا کیا تھا۔ جس سے ہندوستانیوں کو فائدہ ہوا۔ کیونکہ ہماری کرنسی کی قیمت ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ اور اُس وقت تک مشرقی پاکستان میں چل رہی تھی۔ یہ نوٹ وہاں کچھ عرصہ بعد بند ہوئے تھے۔ تبادلہ سے حاصل کی ہوئی ہندوستانی کرنسی کو کاغذ کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر میں نے ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کو پیچھے سے آدھی خالی کر کے اس میں چھپا دیا اس طرح تمام چیکنگ کے مراحل جو بعد میں اصل کیمپ پہنچنے کے دوران اور کیمپ کے اندر طے کرنا پڑے۔ بخیر و خوبی انجام پائے اور ہندوستانی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ان پیسوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔

ہندوستان کو روانگی الوداع
پیارے وطن الوداع

سقوطِ ڈھاکہ کے بارہ دن بعد اسیروں کو سلہٹ سے ہندوستان منتقل کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس سے پہلے منتقلی کا سلسلہ شروع کیوں نہ ہوا؟ اس کا اندازہ ہمیں اپنے کیمپوں میں جا کر ہوا۔ چونکہ ہندوستان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں پاکستانی قیدی بنا لئے جائیں گے، اس لئے اس نے کسی بھی قسم کی تیاری نہیں کی تھی۔ اس مختصر سے عرصے میں انہیں نوے ہزار فوجی اور شہری قیدیوں کے لئے کیمپ تیار کرنے تھے۔ چنانچہ شروع کے چند روز قیدیوں کو مشرقی پاکستان میں ہی رکھا گیا اور جب کیمپ تیار ہو گئے تو انکی

منتقلی شروع کر دی گئی۔ سلہٹ اور آسام کے درمیان ریلوے کا نظام جنگ کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں بسیں اتنی تعداد میں موجود نہیں تھیں کہ وہ منتقلی کے لئے پوری ہو سکتیں۔ علاوہ ازیں سلہٹ اور گوہاٹی کو ملانے والی سڑک کے تقریباً تمام پل تباہ ہو گئے تھے۔ اس مقصد کے لئے سلہٹ میں موجود بسوں کو دریائے سُرما تک استعمال کیا گیا، کیونکہ اس سے آگے دریا کا پل تباہ ہو چکا تھا۔ دوسری طرف سے گوہاٹی تک کے لئے ہندوستانی آسام سے بسیں لے آئے تھے۔ منتقلی مختلف گروپوں کی شکل میں ہوئی۔ ہمارا گروپ دوسرے نمبر پر تھا۔ ہم سے پہلے جانے والے گروپ میں سے ہمارا ایک افسر ریل گاڑی سے فرار ہو چکا تھا جسکی اطلاع ہمیں کسی طرح مل چکی تھی۔ اس خبر نے ہمیں زیادہ محتاط کر دیا، کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ متوقع تھا کہ حفاظتی انتظامات سخت سے سخت تر کر دیئے جائیں گے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست نکلا۔

ہمارے گروپ کو منتقلی کے لئے تیار ہونے کا پیغام شام پانچ بجے ملا۔ اس پیغام میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ افسروں کو ان کے تمام ضروری سامان اور بستر کی اور جوانوں کو دو جوڑے یونیفارم، ایک جوڑا پرائیویٹ کپڑے اور دو کمبل ساتھ لے جانے کی اجازت ہوگی۔ تقریباً ساڑھے سات بجے تک ہم چلنے کے لئے تیار تھے۔ آٹھ بجے دو ہندوستانی افسر آئے۔ انہوں نے تمام تر سامان کی جانچ پڑتال کی اور جسے غیر ضروری سمجھا اسے لے جانے کی اجازت نہ دی، حالانکہ جتنی بھی چیزیں انہوں نے غیر ضروری قرار دے کر لے جانے کی اجازت نہ دی، وہ تمام کی تمام ضروری تھیں۔ مثلاً کتابیں۔ بلیڈ اور کوئی جاذبِ نظر چیز۔ بعد میں علم ہوا کہ دراصل وہ خود یہ چیزیں اپنے مصرف کے لئے رکھ رہے تھے۔ نو بجے تک تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔

بوڑھے بنگالی کے آنسو

ساڑھے نو بجے ماڈل سکول سے ہماری بسیں روانہ ہوئیں۔ بسوں کے ڈرائیور سب بنگالی تھے جو کچھ مغموم نظر آتے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو کل تک پاک فوج کے لئے رضاکارانہ طور پر کام کر رہے

تھے، اور آج خود ہی اپنے رکھوالوں کو دشمن کے حوالے کرنے جا رہے تھے۔ میں جس بس میں بیٹھا تھا اس کا ڈرائیور بوڑھا تھا۔ مجھے وہ ماضی کی باتیں سناتا رہا کہ کس طرح پاکستان کی تحریک چلی۔ کیسے انگریزوں نے سلہٹ کو آسام میں شامل رکھنے کی کوشش کی اور کس طرح سے سلہٹ کے مسلمانوں نے بھرپور جدوجہد کر کے سلہٹ کو پاکستان میں شامل کرایا تھا۔ اس نے بھی اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا تھا اور کیسے کیسے خواب دیکھے تھے مگر آج وہ اپنی آنکھوں سے اس خواب کے ٹوٹتے ہوئے ذرّے دیکھنے کے لئے زندہ تھا۔ جس سرزمین کو اسلام کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ وہ زمین پھر دشمن کے پاؤں تلے آچکی تھی اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ اپنے ہی غدار ہو گئے تھے۔

جب آگ لگانے والے خود ہی ہوں تو بجھانے والا کوئی نہیں ہوا کرتا۔ بھڑکانے والے بھی سارے مل جاتے ہیں۔ اور وہ آگ جو مشرقی پاکستان میں دشمن اور خود غرض لوگوں نے سلگائی تھی، اس نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔ یہ بوڑھا ڈرائیور یہ باتیں سناتا جاتا تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور بس چلی جا رہی تھی۔

رات کو تقریباً دس بجے ہم آسام جاتے ہوئے سلہٹ شہر سے گزر رہے تھے تو لوگ بہت ہی خاموشی سے ہمیں دیکھ رہے تھے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ اس وقت ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے یہ تاثرات ان کے چہروں سے صاف عیاں تھے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ وہ لوگ بہت خوش ہوں گے وہ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اگر وہ خوش تھے تو انہیں تو ہمارا تمسخر اڑانا چاہیئے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ دشمن کے ہاتھوں اپنے مسلمان بھائیوں کو دیکھ کر وہ قطعاً خوش نہ تھے، وہ اس قدر مجبور تھے کہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ خاموشی سے ہمیں الوداع کر دیں۔

رات کو تقریباً گیارہ بجے ہمارا قافلہ دریائے سُرما کے بائیں کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ علاقہ جانا پہچانا تھا۔ ابھی شہیدوں کا خون خشک بھی نہیں ہونے پایا تھا۔ ماحول کی ہر چیز میں اس کی رنگت نمایاں تھی، مگر وقت ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا لیکن جو عقیدت و احترام اس سرزمین کا ہمارے دلوں میں موجزن تھا وہ ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا اور نہ کوئی چھین سکے گا۔ آج بھی اس کی مٹی ہماری آنکھوں کے لئے سرمہ ہے۔ وہاں کی ہر چیز ہمارے لئے اسی طرح مقدس اور قابلِ احترام ہے جس طرح بیت المقدس پر غاصبوں کے قبضے سے اس کا تقدس ہمارے دلوں میں بجائے کم ہونے کے بڑھ گیا ہے۔ اے مقدس سرزمین! ہم شرمندہ ہیں کہ تجھے شورش پسندوں اور شر پسندوں کے پنجے میں جانے سے نہ بچا سکے۔ حالانکہ ہم نے جسم و جان کے حصار قائم کر رکھے تھے۔ مگر اپنوں ہی نے اس حصار کو توڑ کر غیروں کو خوش آمدید کہا۔

میری بس کا بوڑھا ڈرائیور جب مجھے الوداع کہہ رہا تھا تو اس کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ آنسو بہہ نکلنے کے لئے بے قرار تھے، مگر مجبوری کی آہنی دیوار حائل تھی۔ اس بزرگ و محترم چہرے کو میں آج تک نہیں بھلا سکا اور شاید بھلا بھی نہ سکوں۔ یہ تو میری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ یہ مجھے ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا کہ معصوم اور پُر امن بنگالی بھائیوں کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔

اس مختصر سفر کے دوران اس بزرگ نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ہم بھائیوں کے درمیان کس قدر غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اور یہ کہ اس کا ختم کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ ویسے اس دو سال کے مختصر عرصے نے بنگالی بھائیوں کو صحیح خطوط پر سوچنے پر مجبور ضرور کر دیا ہے۔ کچھ غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں، اور باقی انشاء اللہ جلدی ہی دور ہو جائیں گی۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے دس بارہ دن بعد یہ بوڑھا ڈرائیور ہمارے پاس سکول میں کسی کام کے سلسلے میں آیا۔ وہ کافی عرصے سے ہماری فوج کے شانہ بشانہ کام کرتا رہا تھا، مگر اُس وقت وہ مجبور تھا کہ ہندوستانیوں کے احکامات کو بجا لائے، لیکن اس کے دل میں تو وہی جذبات تھے جو اس المیہ سے پہلے تھے۔ اس لئے اس نے ہمارے ایک افسر کو سلام کیا۔ وہ افسر اس پر سخت غصے ہوا اور بُرا بھلا کہنے کے بعد کہا: "مجھے سلام مت کرو۔ جا کر اپنے نئے بھائیوں کو نمستے کہو۔ تمہیں السلام علیکم کہنے کا کوئی حق نہیں۔" دراصل وہ افسر سقوطِ ڈھاکہ سے کچھ ہی روز پہلے مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان پہنچا تھا۔ جنگ

زوروں پر تھی۔ وہ غالباً حالات کا صحیح تجزیہ نہ کر سکا۔ اس نے ہر بنگالی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جو قطعاً درست نہیں تھا۔ اس افسر کی اس بات پر یہ بوڑھا بالکل خاموش رہا۔ اپنی طرف سے اس کے دل کا میل صاف نہیں کر سکتا تھا۔ بوڑھا یہ واقعہ سناتے ہوئے رو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ صاحب ہم نے پاکستان کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اور آج بدقسمتی سے اسے ٹکڑے ہوتے بھی دیکھ لیا۔ کاش اس سے پہلے مجھے موت آجاتی۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا: "سقوطِ ڈھاکہ کے بعد دو تین بار کھانا زہر مار کیا ہے ورنہ چولہے میں آگ تک نہیں جلتی۔ میں اور میری بیوی راتوں کو روتے رہتے ہیں۔"

دریائے سُرما کے بائیں کنارے سے دائیں کنارے تک ٹوٹے ہوئے پل کے اوپر سے ہوتے ہوئے پار گئے۔ دوسری طرف ہندوستانی بسیں پہلے ہی سے ہمارے انتظار میں کھڑی تھیں۔ یہ آسام کے شہر شیلانگ سے لائی گئی تھیں۔ رات کے دو بج چکے تھے اور بسوں پہ سامان وغیرہ لادنے تک تین بج گئے۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں کبھی میری گن پوزیشن ہوتی تھی۔ یہیں سے ہم نے دشمن کے کئی حملے پسپا کیے تھے۔ ساڑھے چار بجے ہمارا قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔ حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ ہر دو بسوں کے بعد مسلح فوج کی ایک گاڑی تھی۔ ہر بس میں ایک مسلح فوجی تھا۔ سورج نکلنے کے ساتھ ہی ہم نے بین الاقوامی سرحد پار کر لی اور ہم دشمن کی زمین پہ سفر کر رہے تھے۔ اپنی سرزمین آنکھوں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ اور دل بیٹھا جا رہا تھا۔ خدا پھر کبھی ایسا منظر نہ دکھائے۔

دشمن کے دیس میں

بسیں چلی جا رہی تھیں۔ راستے میں ہر طرح کے خیالات آتے رہے اور دل کو جلاتے رہے۔ دوپہر کو شیلانگ شہر پہنچ گئے۔ شیلانگ پہنچنے سے پہلے بہت سے مقامات پہ کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مقامات پہ بنگالی، ہندو اور دوسرے

ہندوستانی سڑک کے دونوں طرف کھڑے کبھی ہم پہ پتھراؤ کرتے تھے اور کبھی ہتک آمیز اور نازیبا الفاظ کہتے تھے۔ یہ سب کچھ منظم طور سے کیا گیا تھا۔ ہندوستانی افسروں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ تمام لوگ مشرقی پاکستان سے بھاگے ہوئے ریفیوجی ہیں۔ مگر یہ اندازہ لگانا بالکل مشکل نہ تھا کہ وہ تمام لوگ ہندوستانی تھے اور اپنی حکومت کے ایما پر یہ اوچھی حرکتیں کر رہے تھے۔

شیلانگ پہنچنے کے بعد ہندوستانی افسر جو ہمارے ساتھ تھے، ہمیں ہندوستانی فوج کے پہرے میں چھوڑ کر شیلانگ چلے گئے۔ شیلانگ میں ہم شہر سے باہر گوہاٹی کی طرف چلے جانے والی سڑک پہ واقع ایک جھیل کے کنارے ٹھہرے۔ یہ جھیل "کالے پانی" کے نام سے مشہور ہے۔ نہایت ہی خوب صورت۔ چاروں طرف اونچے پہاڑ ہیں اور درمیان میں جھیل کا صاف شفاف پانی۔ شیلانگ کا شہر بھی کافی خوبصورت ہے۔ جھیل سے شہر کا منظر بہت ہی دلکش لگتا تھا۔ مکانوں کی ٹین کی چھتیں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ جھیل کے کنارے تقریباً چار گھنٹے تک ٹھہرے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ شہر بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ پاکستان کے جنگی قیدی آئے ہیں۔ تھوڑی سی دیر میں پورا شہر ہمیں دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ اس میں بچے، بوڑھے، جوان اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ یہاں پہ غیر متوقع طور پر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب تک ہم وہاں رہے لوگ آتے جاتے رہے۔

کچھ کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں نے آکر ہم سے باتیں بھی کیں۔ ان کے چہروں پہ حیرت کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ سب حیران تھے کہ ایسے جوان کیسے انکے قبضے میں آگئے۔ انہیں کیا معلوم کہ آپس کے تفرقہ سے گھر، خاندان اور ملک تباہ و برباد ہو جایا کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جب سپاہی کو مہروں کی طرح بساطِ سیاست پر استعمال کیا جائے تو نتائج پھر اسی طرح کے نکلا کرتے ہیں۔ ان کو علم نہیں تھا کہ ہماری فوج کن حالات میں اور کن کن کے خلاف لڑتی رہی ہے۔ انہیں تو وہی چیزیں معلوم تھیں جو انہیں آل انڈیا ریڈیو سنایا کرتا تھا۔

شام کے ساڑھے چار بجے ایک ہندوستانی کیپٹن آیا اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر میں یہاں سے TRANSIT CAMP کو روانہ ہوں گے۔ تمام لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ شام پانچ بجے وہاں سے گوہاٹی کو روانہ ہوئے۔ شیلانگ سے پہلے گوہاٹی صوبائی دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔ ساڑھے تین گھنٹے کی مسافت کے بعد گوہاٹی پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ ٹرانزٹ کیمپ وہاں سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی چھاؤنی میں ہے۔ جس کا نام جانگسری تھا۔ رات کو تقریباً نو بجے جانگسری پہنچے۔ فوجی بارکوں کو کیمپوں میں بدل دیا گیا تھا۔ چاروں طرف خاردار تار اور کونوں پر اونچے اونچے ٹاور کھڑے کئے گئے تھے۔ وہاں پر دو ٹرانزٹ کیمپ بنائے گئے تھے۔ کیمپ نمبر ۱ کا انچارج ایک ریٹائرڈ میجر اور کیمپ نمبر ۲ کا میجر گپتا تھا۔ میجر گپتا کیمپ نمبر ۲ کا انچارج ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں کیمپوں کا انچارج بھی تھا۔ ہمیں پہلے دن کیمپ نمبر ۲ میں لے جایا گیا۔

کیمپ کا انچارج ریٹائرڈ میجر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ہم سے ہاتھ ملایا۔ اور کیمپ میں داخل ہونے کے طریقہ کار بتائے۔ میجر بوڑھا تھا اور خلیق بھی۔ طریقہ کار کچھ اس طرح سے تھا کہ کیمپ میں داخل ہونے کے فوراً بعد ایک گیلری تھی۔ جس میں اپنا تمام سامان انسپکشن کے لئے رکھنا تھا۔ انسپکشن کے بعد اپنی اپنی بارکوں کی طرف جانا تھا۔ تلاشی کے دوران سب سے سگریٹ، ماچس، بلیڈ، قینچیاں اور دیگر سامان لے لیا گیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم اپنی بارک کی طرف چلے گئے۔ اس بارک میں تین کمرے اور ایک غسلخانہ تھا۔ ہم کل آٹھ افسر تھے۔ دو کمرے ہمیں دیئے گئے۔ کمروں میں چارپائیاں تھیں اور بستر ہمارے اپنے ساتھ تھے۔ ہمارے اردلی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ بستر لگا کر اپنی بارک کو چلے گئے۔

اوچھے دشمن کی اوچھی حرکتیں

کھانے کا اس رات کو کوئی انتظام نہ ہو سکا اس لئے رات یوں ہی گزری۔ اس بارک کے تین کمروں میں سے ایک میں پہلے سے دو افراد موجود تھے۔ کیمپ کے اندر بھی اس بارک کے

چاروں طرف خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک دروازہ تھا جسے رات کو ساڑھے دس بجے بند کر دیا گیا۔ رات کو ہم میں سے ایک افسر نے تیسرے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر چلا گیا۔ اندر دو زخمی پاکستانی فوجی افسر تھے۔ ایک کیپٹن ظفر اللہ اور دوسرا میجر اکرم۔ میجر اکرم بہت زیادہ زخمی تھے۔ سہارے کے بغیر چل پھر نہیں سکتے تھے۔ اور کیپٹن ظفر اللہ نسبتاً کم زخمی تھا۔ مگر پیٹ کا زخم شدید تھا۔ پھر بھی چل پھر سکتا تھا۔

دونوں افسروں سے ہم سب کی ملاقات ہوئی۔ ان سے مل کر ہم سب کو دلی خوشی ہوئی اور انہیں جس قدر خوشی ہوئی۔ اس کا اندازہ ہم ان کے چہروں سے لگا سکتا تھا۔ ان کے چہروں سے عیاں تھا کہ انہیں وہ چیز مل گئی تھی جس کا انہیں بہت دنوں سے انتظار تھا۔ پاک فوج کے یہ دونوں غازی ضلع میمن سنگھ (مومن شاہی) میں دشمن کی قید میں آ گئے تھے۔ یہ دونوں افسر جانگسری ٹرانزٹ کیمپ سے پہلے سی۔ایم۔ایچ شیلانگ میں زیر علاج تھے۔ ہسپتال میں ہندوستانی ڈاکٹروں نے ان کے علاج میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اور صحت یاب ہونے سے پہلے ہی انہیں کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ کیمپ میں طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ڈاکٹر تو موجود تھا۔ مگر دوائیاں نام کو نہ تھیں۔ ہر صبح کئی بیمار اور زخمی افسر اور جوان ایم۔آئی۔ روم میں جاتے مگر بہت دیر بیٹھنے کے بعد بغیر کسی علاج کے واپس چلے آتے۔

دوسرے دن صبح کیمپ کا ایجوٹینٹ جو نیوی کا سب لیفٹیننٹ تھا، آیا اور کچھ وقت ہمارے ساتھ گزار کر چلا گیا۔ اس نے زیادہ تر باتیں کیمپ کے انتظام وغیرہ کے بارے میں کہیں اور کیمپ کے احکام STANDING ORDERS ہمیں پڑھ کر سنائے۔ اس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد میجر گپتا آ گیا۔ اس نے بہت ہی بھونڈے طریقے سے تمام افسروں کو باہر آنے کے لئے کہا۔ جب تمام افسر اپنے کمروں سے باہر آ کر ایک جگہ کھڑے ہو گئے تو اس نے کہا ”میں آپ کے سامان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں“ ہم نے اپنے اردلیوں کو اپنا سامان باہر لا کر لگانے کے لئے کہا۔ اس پر میجر بگڑ گیا۔ کہنے لگا ”میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ خود اپنا سامان لائیں اور خود ہی تلاشی کرائیں“۔ اس حرکت کا مقصد سوائے ہمیں ذلیل کرنے کے کچھ اور نہ تھا۔ تلاشی تو بہانہ تھا۔ اس

نے تلاشی لی اور ہماری جو بھی چیز اسے اچھی لگی وہ اس نے رکھ لی۔ تلاشی کے دوران اور بعد میں وہ ایسی باتیں کرتا رہا جو نہایت ہی تحقیر آمیز اور دل آزار تھیں۔ ہم میں سے بعض افسروں نے ترکی بہ ترکی جواب بھی دیئے مگر ہمارے سینیئر افسروں کے بیچ میں آنے کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اس ترش کلامی کے بعد میجر گپتا میں زیادہ باتیں بنانے کی ہمت نہ رہی۔ اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے نصف گھنٹہ بعد ہمارے ایک جوان نے آ کر اطلاع دی کہ قیمتی اشیاء جمع کرنے کے لئے ایک ہندوستانی افسر کیمپ میں آیا ہوا ہے۔ ہم تیار ہو کر وہاں گئے جہاں ہندوستانی کیپٹن (نام ذہن سے نکل گیا ہے) نے قیمتی اشیاء جمع کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ تمام لوگ جو ہمارے ساتھ تھے انکی قیمتی اشیاء (مثلاً گھڑی ریڈیو اور انگوٹھی) جمع کرائی گئیں۔ جمع شدہ اشیاء کی باقاعدہ رسیدیں دی گئیں۔ اشیاء کے علاوہ پاکستانی کرنسی بھی جمع کی گئی۔ اس کی بھی باقاعدہ رسید دی گئی۔ علاوہ ازیں ہمارے جنگی قیدی کارڈ بھی یہیں پر تیار کئے گئے۔ یہاں ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں کسی بھی وقت وہاں سے چلنے کا حکم دیا جا سکتا ہے۔

ہندو نے اپنی ذہنیت بے نقاب کی

جہاں تک اس کیمپ کے حفاظتی انتظامات کا تعلق تھا۔ ہندوستانیوں نے کسی قسم کا خطرہ مول لینے کا کوئی امکان نہ چھوڑا۔ کیمپ کے چاروں طرف تقریباً دس فٹ اونچی خاردار تار کی باڑیں لگی ہوئی تھیں۔ انکے درمیان کے حصے میں مسلح سپاہی دن رات گشت کیا کرتے تھے۔ ہر کونے پر ایک ایک اونچا ٹاور (مچان) تھا جس پر دن رات دو سپاہی خودکار ہتھیاروں سے مسلح موجود ہوتے تھے۔ ان ٹاوروں پر سرچ لائٹیں بھی لگی ہوئی تھیں جو رات کو بوقت ضرورت کسی بھی علاقے کو دن کی طرح روشن کر دیتی تھیں۔ ان انتظامات کے باوجود افسروں کے کمروں کے چاروں طرف خاردار تار کی ایک اور باڑ لگا دی گئی تھی،

جس کا ایک دروازہ تھا جو رات کو نو بجے بند کر دیا جاتا تھا۔ ان حفاظتی انتظامات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستانی کس قدر محتاط تھے۔

یہاں پر دو رات قیام کرنے کے بعد ہمیں کیمپ نمبر ۲ میں منتقل کر دیا گیا جس کا انچارج میجر گپتا تھا۔ اس کیمپ میں افسروں کو ایک لمبی بارک میں رکھا گیا۔ اس کے چاروں طرف خاردار تار تو نہ تھے مگر نو بجے کے بعد اس کا دروازہ مقفل کر دیا جاتا تھا۔ جوائج ضروریہ کے لئے دو کنستر بارک کے اندر رکھ دیئے گئے تھے۔ ان سے کمرے کی فضا نہایت ہی متعفن رہتی تھی۔ میجر گپتا سے شکایت بھی کی گئی۔ اس نے جواب دیا کہ اسے جنرل ہیڈ کوارٹر سے ایسے احکامات ملے ہوئے ہیں جن کے تحت وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ میجر گپتا ہمیں پریشان کرنا چاہتا تھا۔ اس کیمپ میں دو دن کے قیام کے دوران دو واقعات ایسے ہیں جو کہ قابل ذکر ہیں۔

پہلا واقعہ یوں ہے کہ پاکستانی سکاؤٹس کے بھی کچھ جوان اس کیمپ میں تھے ان میں ایک کے کپڑوں سے کوئی پرانا بلیڈ برآمد ہو گیا۔ قیامت بپا ہو گئی۔ بہت دیر میجر گپتا شور مچاتا رہا۔ آخر کار اس نے اس جوان کا منہ کالا کر کے پورے کیمپ کا چکر لگوایا۔ ہم سب شرم سے گڑھے جاتے تھے اور غصے سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ مگر بے بسی خدا کی بدترین لعنتوں میں سے ہے۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جنہیں اس سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ دوسرا واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ پر ہندوستانی سوچ اور ذہنیت واضح ہو جائے۔

یہ واقعہ اس طرح ہے کہ اس کیمپ میں پہنچنے کے دوسرے دن بعد از سہ پہر ہم کچھ افسر اپنی بارک سے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کیمپ کے دروازے پر ایک کار رکی۔ اس میں سے دو عورتیں اور ایک ادھیڑ عمر مرد نکل کر کیمپ میں آئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ کیمپ کے ایجوٹینٹ کے ساتھ ہمارے پاس آ گئے۔

ایجوٹینٹ نے ان کا تعارف کرایا۔ وہ ہندوستانی فوج کا کرنل تھا۔ بہت سے موضوع زیر بحث آئے۔ مگر زیادہ وقت کرنل صاحب ہی تقریر فرماتے رہے۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کو ایک نہ ایک دن عالمی سیاست میں وہ مقام مل جائے گا جو امریکہ، روس اور

چین کو حاصل ہے۔ پاکستان اپنی بقا کے لئے ناکام رہا ہے۔ اسے (خدا نہ کرے) ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہی ہے اگر پاکستان کے لیڈر اس حقیقت کو سمجھ لیں، اور ہندوستان سے کنفیڈریشن کرلیں، تو ہندوستان وہ مقام جس کیلئے حکومت کام کر رہی ہے، بہت جلد حاصل کرسکتا ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر نہ سمجھیں بلکہ ان میں اپنے آپ کو مقید کرلیں۔ اور اسی کی نسبت سے اپنے آپ کو منسوب کریں۔

آپ اس سے اچھی طرح اندازہ لگالیں کہ ہندوستانیوں کے کیا عزائم ہیں، اگر وہ اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب ہوگئے تو جو حشر مسلمانوں کا اس خطے میں ہوگا۔ اس کے تصور ہی سے روح کانپ جاتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ وہ حضرات جنہیں ہندوانہ ذہنیت سے واسطہ نہیں پڑا، وہ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کریں گے، اس کے بعد تن من دھن سے اس باطل نظریئے کو کہ ہندوستانی ہمارے دشمن نہیں ہیں، دوسروں کے ذہنوں سے بھی مٹانے کے جہاد میں عملی حصہ لیں گے۔ اگر آج ہم ہوش میں نہ آئے تو بحیثیت قوم ہمارا مستقبل تاریک ہوگا، اور تاریخ اور ہماری آنے والی نسلیں ہمیں کبھی بھی معاف نہیں کریں گی۔

اس ننھی بچّی کو
پاک فوج کا سلام

جانگھری کیمپ میں ہمارے قیام کے چوتھے دن چند ایک ہندوستانی افسر ہمارے کیمپ میں آگئے۔ یہ سب کے سب ہماری بارک میں آئے اور نئے سال کی مبارک باد دینے لگے۔ ہمیں احساس تک بھی نہ تھا، کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ وہ لوگ کافی دیر ہمارے ساتھ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب جانے لگے تو ہم نے ان سے دریافت کیا کہ وہاں سے کب تک ہم اپنے کیمپ کیلئے روانہ ہوں گے۔ اور ہمیں کون سے کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے، انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی روز رات کو تقریباً دس بجے ہمیں بتایا گیا کہ کل صبح ہماری ٹرین روانہ ہوگی ہم تیار رہیں۔ تیاری کا رسماً بتا دیا جاتا تھا، ورنہ تیاری کی ضرورت ہی نہ تھی ہم تو اس حالت میں تھے کہ ہر دم تیار رہتے۔ دوسرے دن صبح تقریباً نو بجے پرائیویٹ ٹرک ہمیں لینے کے لئے آگئے۔ یہ ٹرک ہر طرف سے بند تھے

ان میں ہمیں سوار کر کے جانگھری ریلوے سٹیشن لے جایا گیا۔ ٹرین پہلے سے کھڑی تھی۔ وہاں کیپٹن سہگل سے ہمارا تعارف کیمپ ایجوٹینٹ نے کرایا اور بتایا کہ کیپٹن سہگل ہماری ٹرین کے گارڈ آفیسر ہوں گے۔ کیپٹن سہگل نے ہمارے سینئر افسر کو ٹرین میں جگہ کے بارے میں اور راستے میں کھانے پینے کا بندوبست کرنے اور دیگر انتظامات کے بارے میں بتایا۔

افسروں کے لئے درجہ اوّل کے ڈبوں کا انتظام کیا گیا تھا، مگر جوانوں کے لیے جو ڈبے تھے ان کی کھڑکیوں کو لکڑی کی تختیوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ ہمارے افسروں نے ہندوستانی افسروں سے احتجاج کیا۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہُوا۔ کیپٹن سہگل نے نئی صورتِ حال سے اپنے بالائی افسروں کو مطلع کیا تو انہوں نے فیصلہ دیا کہ ٹرین کو گوہاٹی ورکشاپ بھیجا جائے اور تمام کھڑکیوں کے ساتھ تختیوں کی بجائے لوہے کی سلاخیں لگا دی جائیں۔ اس حکم کے تحت ٹرین کو گوہاٹی بھیج دیا گیا۔ ہمارے تمام جوانوں کو وہیں پلیٹ فارم پر اتار دیا گیا، اور افسروں کو واپس کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ انہیں یہ خطرہ تھا کوئی نہ کوئی افسر ضرور فرار ہو جائے گا۔

شام ساڑھے چار بجے کیپٹن سہگل نے اطلاع دی کہ ٹرین واپس آگئی ہے اور شام کے بعد کسی بھی وقت روانہ ہو جائیں گے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی رات کا کھانا آگیا جو زہر مار کیا اور ایک پرائیویٹ ٹرک میں بیٹھ کر سٹیشن کو روانہ ہوئے۔ سٹیشن پہنچے تو سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ ٹرک سے اتر کر افسر ٹولیوں میں الگ الگ کھڑے ہو گئے۔ ہندوستانی سپاہی چاروں طرف پہرہ دے رہے تھے کچھ سویلین بھی سٹیشن پر آجا رہے تھے۔ بیس پچیس منٹ بعد خاصا اندھیرا ہو گیا اور اس وقت وہ واقعہ ہُوا۔ جس کو میں آج بھی جب یاد کرتا ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ایک چھوٹی سی بچی آئی اور اس نے سرگوشی میں ہمیں مخاطب کیا۔ کہنے لگی: بھائی جان! ہم اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ہم نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کچھ ہے جو کپڑے میں لپٹا ہُوا تھا۔ مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس میں کیا ہے۔

وہ معصوم پھر کہنے لگی: بھائی جان! یہ میری امّی نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اگر موقع ملے تو یہ ہمارے پاکستانی بھائیوں کو دے آؤ۔ مجھے موقع مل گیا ہے۔ بھائی جان! یہ آپ

لے لیجیے۔"

جذبات کا ایک سمندر تھا جو آناً فاناً ہمارے دلوں میں موجزن ہو گیا۔ میرا جی چاہا کہ خوب روؤں۔ اور جذبات میری آنکھوں سے بہہ کر نکل جائیں۔ مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ وہ جو کچھ بھی تھا اسے فوراً لے لیا جائے کیونکہ اس لڑکی کا ہمارے پاس زیادہ دیر کھڑا رہنا خطرناک ثابت ہو کر اسے مشکل میں ڈال سکتا تھا۔ ہم جانتے تھے کہ بچی پکڑی گئی تو ہندو اس کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک کریں گے۔ ہم نے فوراً وہ کپڑا بچی سے لے لیا اور اسے چلے جانے کو کہا۔ بچی بڑی خوش خوش واپس چلی گئی۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور ہمیں خوشی اس بات کی تھی کہ مسلمان بیٹیاں کتنی دلیر اور نڈر ہوتی ہیں۔ ہماری اس بچی نے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر ہماری مدد کی تھی۔

اس کپڑے کو کھول کر دیکھا تو اس میں کچھ ہندوستانی روپے نکلے۔ خدا کی قسم یہ روپے پوری دنیا کی دولت سے زیادہ تھے۔ یہ روپے خلوص، پیار، ملی اتحاد اور ایک عظیم رشتے کے پیغامبر تھے۔

اگلا سفر، سوئے زنداں

تمام حیوانوں کو ڈبوں میں بند کرنے کے بعد ہم سب افسر اپنے کمپارٹمنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب تمام ڈبوں کی کھڑکیوں کے ساتھ لوہے کی سلاخیں لگائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ دروازوں میں دوہرے قفل INTER LOCK کے علاوہ ایک زنجیر ڈال کر اسے بھی مقفل کر دیا گیا تھا اور ہر دروازے پر ایک مسلح سنتری کھڑا تھا۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر ٹرین کوئی پانچ گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوئی۔ میری آنکھ لگ گئی تھی۔ ٹرین کے شور سے میری آنکھ کھلی۔ باہر دیکھا تو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں سوچنے لگا کہ باہر اجالا بھی ہوتا تو کیا فرق پڑ جاتا۔ ہم تو قید کے اندھیرے میں پھینک دیئے گئے ہیں۔ نہ جانے کب قید سے آزادی نصیب ہو گا۔ مگر ایک عزم تھا، ایک جذبہ تھا، ایک لگن تھی، جس کے زیر اثر ہر لمحہ دل میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ قید کا عرصہ طویل نہیں ہو گا۔ کم از کم میرے دل میں اس امید کی کرن روشن ہوتی جا رہی تھی

کہ میں پنجرے کو توڑ کر اڑ جاؤں گا۔

کچھ اور خیال بھی آئے۔ بعض نے پریشان اور اداس بھی کیا۔ ذہن میدانِ جنگ میں واپس چلا گیا تو میری آنکھ لگ گئی۔ اب جو آنکھ کھلی تو ہر طرف روشنی تھی اور ہم ابھی تک آسام کے ہی علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ جس کا اندازہ مجھے چائے کے باغات کو دیکھ کر ہوا۔ کیپٹن سہگل ہمارے ڈبے میں آیا۔ کیپٹن سہگل گورکھا رجمنٹ کا افسر تھا اور مذہب کا ہندو مگر دوسرے ہندو افسروں کی طرح متعصب نہیں تھا۔ خاصا ہنس مکھ اور دلچسپ آدمی تھا۔ ہمارے ڈبے میں میرے علاوہ تین اور پاکستانی افسر تھے۔ تھوڑی دیر میں کیپٹن سہگل کا اردلی چائے لے کر آ گیا۔ جو اس نے خاص طور پر ہمارے لئے بنوائی تھی۔ چائے کے دوران میں نے کیپٹن سہگل سے پوچھا کہ ہماری منزل کونسی ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ خود بھی اس سے بے خبر ہے۔ راستے میں اسے کسی سٹیشن پر ہندوستانی ملٹری پولیس کا کوئی آدمی مل جاتا جو اسے وہاں سے اگلے مقام تک ٹرین لے جانے کا پیغام دیتا۔ ریل گاڑی رات کو چلائی جاتی اور دن کو کسی چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی رکھی جاتی تھی۔ جس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ ہندوستانی نہیں چاہتے تھے کہ ہم وہاں کے علاقوں اور لوگوں کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ یہ بھی ان کی ایک احتیاطی تدبیر تھی۔ وہ ہمارے فرار کو ناممکن بنانا چاہتے تھے۔

میں نے ٹرین سے فرار کے کئی طریقوں پر غور کیا۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اندر کھڑے سنتری کو قابو کر کے اور ہندوستانی افسر کو یرغمال بنا کر فرار ہوا جائے۔ مگر چند ایک وجوہات کی بنا پر عمل نہ ہو سکا، اور دوسرے طریقوں کے لئے بھی احوال و کوائف سازگار نہیں تھے۔ بہرحال میرے دل و دماغ پر فرار غالب رہا۔

سفر کے دوران کئی ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ ایک اس وقت پیش آیا جب ہماری ٹرین مغربی بنگال کے علاقے سے گزر رہی تھی۔ ہندوؤں اور ہندو بنگالیوں نے ہماری ٹرین پر اندھا دھند پتھراؤ شروع کر دیا۔ ایک خاصا بڑا پتھر کیپٹن سہگل کے ڈبے کی کھڑکی پر لگا جس نے شیشہ چکنا چور کر دیا۔ کیپٹن سہگل نے فوراً زنجیر کھینچ کر گاڑی کو روکا اور ریوالور ہاتھ میں لے کر ہجوم کی جانب دوڑنے لگا۔ ہجوم تتر بتر ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ٹرین کو دوبارہ چلا دیا گیا۔ کیپٹن سہگل نے اس ناخوشگوار واقعہ پر اظہار افسوس بھی کیا۔

دوسرا واقعہ یوپی کے علاقے میں پیش آیا۔ ایک سٹیشن پر جن سنگھیوں نے باقاعدہ لاؤڈ

سپیکروں سے پاکستان کے خلاف اشتعال انگیز اور انتہائی نازیبا الفاظ کہے۔ ہم نے پورے جوش و خروش اور غضب سے جواب دیا اور جلد ہی ہماری ٹرین کو وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ جن بنگلوں ہی نہیں تمام تر ہندو خواہ وہ کسی جماعت سے متعلق تھے یا نہیں۔ پاکستان کی اور پاکستان کے جنگی قیدیوں کی تذلیل کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصے رہے تھے۔ اس قوم کی تاریخ میں پہلی بار مسلمان اس کے ہاتھوں میں آیا تھا۔ لہٰذا ہندو نہایت اوچھے طریقوں اور گھٹیا الفاظ سے اس نفرت کا اظہار کر رہے تھے جو اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بھری ہوئی تھی۔

ریل گاڑی سے فرار کی کوشش

ستائیس گھنٹوں کے دوران صرف ایک بار چائے اور کھانا تیار کرنے کی اجازت ملی۔ حالانکہ وقت بہت ملتا تھا۔ مگر کیپٹن سہگل کی زبانی معلوم ہوا کہ راشن کم تھا۔ راستے میں کسی چھوٹے اسٹیشن پہ گاڑی روک لی جاتی۔ وہیں پہ ہمارے اپنے باورچی جوانوں اور افسروں کے لئے کھانا تیار کرتے تھے۔ ہندوستانی گارڈ کے جوان بھی اپنے لئے کھانا خود تیار کرتے۔ کھانا پکانے کے لئے بہت تھوڑا وقت دیا جاتا تھا۔ جونہی کھانا تیار ہوتا۔ جوانوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ جو انہیں گاڑی کے اندر بیٹھ کر کھانا پڑتا۔ پہلا کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک ٹرین وہیں کھڑی رہی۔ افسروں کو باہر آنے کی اجازت تھی۔ جس کا کسی کو کوئی شوق نہ تھا۔ ہم پہ متعین ہندوستانی گارد میں ایک مسلمان بھی تھا۔ وہ بڑی ہی مجبوری اور بے بسی کے عالم میں ہمیں دیکھتا اور جب کبھی تنہائی میں اسے ہم میں سے کسی سے ملنے کا اتفاق ہوتا وہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا اور بہت کوشش کرتا کہ اپنی داخلی بے چینی پر قابو پائے رکھے مگر اکثر اس کی آنکھیں وفا نہ کر سکتیں۔ اور مجھے یہ شعر یاد آجاتا ہے

جو پاسِ ضبط سے ڈر ڈر کے ٹپکا
وہ آنسو چاند سے بڑھ کر گراں ہے

یہ ہندوستان کے صرف ایک مسلمان کے جذبات اور احساسات نہیں بلکہ وہاں کے ہر ایک مسلمان کے تھے۔ خون اور مذہب کے مستحکم اور مقدس رشتے اس ایک مسلمان سپاہی کی آنکھوں میں چمک کر سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا حالِ دل سنا رہے تھے۔

ہم نے ٹرین سے فرار ہونے کی ایک سکیم بنائی۔ اس کے مطابق بیت الخلا کا کموڈ اکھاڑنے کی کوشش کی گئی۔ اگر یہ اکھاڑ لیا جاتا تو چلتی گاڑی سے نکلنے کا راستہ مل جاتا، مگر کسی آواز کے بغیر کموڈ نہ اکھاڑا جا سکا۔ خاصے غور و خوض کے بعد ایک اور طریقہ سوچا گیا جو یوں تھا کہ ہمارے ڈبے کے اندر متعین سنتریوں کو زیر کر کے ان سے چابی چھینی جائے اور دروازہ کھول کر گاڑی سے کود جائے۔ سب متفق ہو گئے۔ لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔

راستے میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں کو پتہ چل جاتا کہ پاکستان کے جنگی قیدیوں کی سپیشل ٹرین جا رہی ہے تو وہ بہت بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے۔ ان کے چہروں پر میں نے کرب کے جو آثار دیکھے ہیں وہ میں ساری عمر نہیں بھلا سکوں گا۔ ٹرین ایک بڑے سٹیشن پر رکی تو دیگر لوگوں کے علاوہ کچھ نوجوان بھی اکٹھے ہو گئے۔ یہ لوگ زیادہ دور نہیں تھے اس لئے ان کی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ جنگی قیدی ہیں انہیں فرسٹ کلاس میں کیوں بٹھایا گیا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ یہ افسر ہیں اور جنیوا کنونشن کے تحت افسروں کے ساتھ افسروں کی طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ بہت سارے نوجوان غصے میں آگئے اور کہنے لگے کہ یہ افسر ہیں تو کیا، ہمارے دشمن تو ہیں۔ اسلئے ہمیں انکے ساتھ قیدیوں کا سلوک کرنا چاہیئے تاکہ یہ لوگ ہمیشہ یاد رکھیں۔ اور واقعی آج تک مجھے ہندو ذہنیت یاد ہے۔ ہندوستان کے نوجوانوں کو خوش ہونا چاہیئے، کیونکہ انکے احساسات کا احترام کرتے ہوئے اسکو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

گنگا کے کنارے

پانچ دنوں کی مسافت کے بعد ہم اپنی منزل پہ پہنچے جس کے متعلق ہمیں یہاں پہنچنے تک نہیں بتایا گیا تھا۔ اس سٹیشن پہ چھوٹا سا ایک ریلوے ورکشاپ بھی تھا جس کے قریب لے جا کر ہماری ٹرین کو روکا گیا۔ یہاں پہ صرف افسروں کو نیچے اترنے کی اجازت تھی۔ جوانوں کو ٹرین میں بند رہنا تھا۔ ہر طرف پہرہ بڑا ہی سخت تھا۔ یہاں پہ ہندوستانی افسروں سے پتہ چلا کہ ہمارے کیمپ کا نمبر ۵۴ ہے اور وہ فتح گڑھ چھاؤنی میں بنایا گیا ہے۔ فتح گڑھ دریائے گنگا کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہے اور یہاں پر راجپوت رجمنٹ کا رجمنٹل سنٹر ہے۔ ہندوستانی افسروں کی زبانی معلوم ہوا کہ پاک فوج کی نمبر ۶ پنجاب رجمنٹ کے افسر بھی اسی کیمپ میں ہیں۔ میں کچھ خوش ہوا کیونکہ ملٹری اکیڈیمی کاکول میں میرا پلاٹون کمانڈر انسٹرکٹر میجر طارق پرویز بھی اسی یونٹ میں تھا۔ کاکول سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد میری اس سے کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اکیڈیمی کے بعد ہماری پہلی ملاقات دیارِ غیر میں ہونے والی تھی، اور یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ طارق پرویز اور میں ایسے کٹھن سفر کے ہمسفر ہوں گے جو ہمیں موت تک لے جا سکتا تھا۔

سٹیشن پر بہت سے شہری اکٹھے ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آٹھ بج رہے تھے ہم نے ناشتہ کرنے کے لئے اجازت مانگی، مگر ہندوستانیوں نے یہ کہہ کر اجازت نہ دی کہ تھوڑی ہی دیر میں یہاں سے کیمپ کو روانگی ہو جائے گی۔ اس لئے چائے کیمپ میں ہی چل کر تیار کریں۔ راستے میں چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا ملنے کی وجہ سے

بھوک نے بھی زیادہ ستانا شروع کر دیا تھا، مگر میرے مجاہدوں نے غیر معمولی صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستانی اچھی طرح جانتے تھے کہ تین یا چار گھنٹوں سے پہلے وہاں سے روانگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی صرف تنگ کرنے کی غرض سے لوگوں کو نیچے آنے کی اجازت نہ دی اور ناشتہ تیار کرنے کی اجازت بھی نہ دی۔ یہ تمام حرکات ان کی گھٹیا اور مسلم کش ذہنیت کی عکاسی کر رہی تھیں۔ تقریباً گیارہ بجے سب کو نیچے اتارا گیا اور ان کے سامان کی جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔ یہاں پر بھی جانچ پڑتال کے دوران ہر اچھی چیز کو ہتھیا لینے کی کوشش کی گئی اور کئی ذاتی چیزیں ہتھیائی بھی گئیں۔

فتح گڑھ ریلوے سٹیشن پر دیگر لوگوں کے علاوہ راجپوت رجمنٹل سنٹر کا کمانڈنٹ کرنل موجدار بھی موجود تھا۔ ریلوے سٹیشن پہنچنے پر وہاں کے لوگوں نے اپنے ہندوستانی فوجیوں کا بڑی ہی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ چند ایک جوان لڑکیوں نے اپنے فوجیوں کے ماتھوں پہ تلک لگائے اور تحفے پیش کئے۔ وہ ان کے فاتح سپاہی تھے۔ یہ معمولی سی بات نہیں تھی۔ انہوں نے پاکستان کو شکست دی تھی۔ اس شکست کے اسباب خواہ کچھ ہی تھے۔ لیکن آخر شکست شکست ہوتی ہے۔ سٹیشن پہ بہت بڑی تعداد میں شہری اکٹھے ہو گئے تھے، مگر انہیں ایک خاص جگہ سے آگے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ لوگ بڑے ہی تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ یہی پاکستانی فوجی تھے جن کے نام سے یہ لوگ خوفزدہ رہتے تھے۔ اب بھی ان کے چہروں سے یہ بالکل عیاں تھا کہ وہ اپنے آپ کو فاتح تصور نہیں کر رہے۔ اور ان کے چہروں پر فتح والی رونق اور تمکنت نہیں تھی، بلکہ یہ تاثرات تعجب اور مخبوط الحواسی کے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک ہندوستانی افسر نے ہمارے سینئر آفیسر سے کہا کہ سنٹر کمانڈنٹ تھوڑی ہی دیر میں ہم سے کچھ باتیں کریں گے۔ چنانچہ تمام افسر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ کرنل موجدار کے ساتھ اس کی بیوی اور دو لڑکیاں بھی تھیں، مگر جس وقت کرنل ہمارے پاس آیا وہ کچھ پیچھے ہی رہ گئیں۔ کرنل نے ہمیں خوش آمدید کہا اور مختصر سی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستانی افواج کی یہ خواہش نہیں تھی کہ وہ ایک باقاعدہ فوج کے افسروں اور جوانوں کو قید میں رکھے، مگر چند سیاسی وجوہات کی بنا پر ایسا کرنا بہت ضروری ہو گیا

تھا۔ یہ فوجی حکام کے اختیار سے باہر تھا، اور یہ کہ بہت جلد ہم لوگ اپنے ملک بھیج دیئے جائیں گے۔

ہمیں ہر بات کا علم تھا، اور ہندو ذہنیت کا کافی تجربہ بھی تھا، اس لئے ہم نے کبھی اس پر یقین نہیں کیا کہ ہم بہت تھوڑے عرصے میں واپس اپنے وطن بھیج دیئے جائیں گے۔ صدیوں بعد ہندوؤں کو اپنی فوج کا مورال بڑھانے کا موقع ملا تھا۔ اس سے انہوں نے تمام بین الاقوامی قوانین اور ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر فائدہ اٹھایا۔

کرنل موحیدار کے خطاب کے بعد تمام جوانوں کو گاڑی سے اتار کر انہیں ان کی یونٹوں اور سب یونٹوں کے لحاظ سے مختلف گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس دوران وہاں جو ہندو شہری جمع ہو گئے تھے وہ ہم پر آوازے کستے رہے اور اسی جگہ پاش فضا میں ہم فوجی گاڑیوں میں سوار ہو کر اپنے کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑیوں کو چاروں طرف سے بند کر دیا گیا تھا۔ تاکہ کوئی آدمی دیکھ نہ سکے کہ یہ شہر کیسا اور ماحول کیا ہے۔ یہ بھی فرار کے خلاف ایک احتیاطی تدبیر تھی۔

تنازعہ شلوار پاجامے کا

کیمپ کے صدر دروازے پر کیمپ کے کمانڈر میجر نے تمام افسروں کو بلایا اور کیمپ میں داخل ہونے کا طریقہ کار بتایا۔ اس سے پہلے ہم کئی مقامات پر تلاشی کا شکار ہو چکے تھے۔ مگر یہاں پر بھی سب سے پہلا کام یہی کیا گیا۔ تمام سامان ایک بار پھر کھلوا کر تلاشی لی گئی جس کا واحد مقصد ہم سب کو تنگ کرنا تھا۔ ورنہ تلاشی کی نہ ضرورت رہی تھی نہ گنجائش۔ تلاشی ختم ہونے کے بعد ہمیں ایک وسیع گراؤنڈ میں لے جایا گیا۔ وہاں کیمپ کے ایجوٹینٹ کیپٹن جسوال سے سامنا ہوا۔ وہ نہایت ہی متعصب ہندو تھا۔ آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس افسر نے کس طرح اور کن طریقوں سے پاکستان کے مجاہدوں کو ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

گراؤنڈ میں پہنچتے ہی کیپٹن جسوال نے سب کو حکم دیا کہ قطار بنا کر اور اپنے اپنے سامنے اپنا اپنا سامان کھول کر کھڑے ہو جائیں۔ چنانچہ ایک بار پھر تلاشی کے بہانے ہمیں تنگ کرنے کا موقع ان کے ہاتھ آگیا۔ تلاشی کے دوران کیپٹن جسوال کا رویہ نہایت ہی ہتک آمیز تھا۔ اس نے بتایا کہ صرف ایک بستر، ایک وردی اور پرائیویٹ کپڑوں کا صرف ایک جوڑا ساتھ رکھنے کی اجازت ہوگی، اور باقی تمام چیزیں کیمپ کے سٹور میں رکھ دی جائیں گی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پاجاموں اور شلواروں کے آزار بند نکال لئے گئے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آزار بند کے بغیر شلوار پاجامہ کیسے پہنا جائے گا تو جواب ملا۔ اوپر سے یہی حکم آیا ہے۔ حکام سے ایسے ہی احکامات ملے ہیں۔ ہم نے پاجامے اور شلواریں لینے سے انکار کر دیا۔ کیپٹن جسوال نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا: "آپ لوگ حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ آپ کو یہ چیزیں ساتھ لے جانی ہوں گی"۔

ہم نے صاف انکار کر دیا۔ بات کیمپ کمانڈر تک گئی بالآخر دو جوڑے وردی اور دو جوڑے پرائیویٹ (آزار بندوں سمیت) کی اجازت مل گئی۔ جوانوں کو ایک طرف، جے سی۔ او (صوبیداروں اور نائب صوبیداروں کو) ایک طرف اور افسروں کو ایک اور طرف لے جایا گیا۔ جب ہم اپنے حصے میں پہنچے تو پاک فوج کے کچھ افسر وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے کچھ جاننے والے تھے اور کچھ ناآشنا۔ بہرحال بڑے ہی رقت آمیز انداز سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ ان میں ۶ پنجاب رجمنٹ کے تمام افسر، فیلڈ انجینئرز کے کچھ افسر اور ملیشیا سکاؤٹس کے افسر شامل تھے۔

ان ہی میں میجر طارق پرویز تھے جو پاکستان ملٹری اکیڈمی میں میرے انسٹرکٹر رہ چکے تھے۔ بہت ہی گرمجوشی سے ملے اور اپنی بدقسمتی کا ذکر کرتے لگے کہ اکیڈمی کے بعد کتنی بری جگہ ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ ہم اپنے اپنے سیکٹروں کی باتیں کرتے رہے۔ طارق پرویز کی یونٹ ۶ پنجاب جنگ کے دوران جیسور کے محاذ پر تھی، جہاں اس نے شجاعت اور فرض کی لگن سے دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ تمام تر مشکلات اور بے مائیگی کے باوجود یہ یونٹ آخر دم تک سینہ سپر رہی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس یونٹ کے نصف سے زیادہ افسر اور جوان شہید ہو گئے۔

میجر طارق نے مجھ سے پوچھا کہ میں فرار ہونے کا کوئی ارادہ رکھتا ہوں کہ نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ نہ صرف میں فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں بلکہ اس کے لئے ٹرین سے کوشش بھی کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔

میجر طارق نے یہ بتا کر میرے عزم اور حوصلے میں جان ڈال دی کہ چند افسر اور بھی ہیں جو فرار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور انشاء اللہ موقع ملتے ہی ہم ضرور فرار ہوں گے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی ہدایت کی کہ ایک عدد پرائیویٹ کپڑوں کا جوڑا میں ضرور چھپا کر رکھوں تاکہ فرار ہونے کے بعد اسے پہنا جا سکے یہاں ہمیں یہ بھی علم ہوا کہ اس بارک میں ہمیں صرف چند دن رکھنے کے بعد OFFICER'S CAGE میں منتقل کر دیں گے جو ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔

قیدی کیمپ نمبر ۴۵

یہ کیمپ یوپی کے شہر فتح گڑھ کی چھاؤنی میں قائم کیا گیا تھا۔ جو بارکیں ہمارے لئے منتخب کی گئی تھیں وہ انگریزوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن اور اطالوی جنگی قیدیوں کیلئے بنائی تھیں۔ جنگ کے بعد ان بارکوں کو راجپوت سنٹر کی تحویل میں دیدیا گیا تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد ان بارکوں کو ایک بار پھر جنگی قیدی کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہمیں عہدوں کے لحاظ سے الگ الگ کر دیا گیا، اور اس کے مطابق الگ الگ بارکوں میں رکھا گیا۔

کیمپ کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑیں لگا دی گئی تھیں، جن کی تین قطاریں تھیں ایک قطار میں خاردار تاروں کے رول (لچھے) زمین پر بچھا دیئے گئے تھے، تاکہ دوسری قطار کے تاروں تک کوئی پہنچ نہ سکے۔ دوسری قطار تقریباً دس فٹ اونچی اور تقریباً دو فٹ اوپر والے حصے پر ترچھے تار لگا دیئے گئے تھے تاکہ کوئی اوپر نہ چڑھ سکے۔ اور تاروں کی تیسری قطار کے درمیان ۱۰ فٹ کی ایک گیلری بن گئی تھی جس میں ہندوستانی سپاہی گشتی پہرہ دیتے تھے۔ ایک ایک سو گز کے فاصلے پر تیس فٹ اونچی لکڑی کا بنا ہوا ایک ٹاور تھا ہر ٹاور

ہر دن رات خود کار ہتھیاروں سے مسلح ایک سنتری پہرے پر رہتا تھا۔

بارکوں میں افسروں کے لئے چارپائیاں اور کچھ فرنیچر رکھا گیا تھا۔ اور چھوٹا سا ایک میس بھی تھا جسے ۴ پنجاب کے افراد چلا رہے تھے۔ حوائج ضروریہ کے لئے زمین کھود کر بیت الخلا بنایا گیا تھا۔ اسے DEEP TRENCH LATRINE کہتے ہیں۔

نہانے کے لئے کھلے میدان میں بوریوں سے چند غسلخانے تیار کئے گئے تھے، جو اوپر سے بالکل کھلے تھے، پانی گرم کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا، اس لئے کھلے آسمان تلے ٹھنڈے پانی سے ہی غسل کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے لئے ٹھنڈا پانی اور سردی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے صابن نہیں مل رہا تھا۔ ایک دو بار ہندوستانیوں سے اس تکلیف کا ذکر کیا، مگر وعدے کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔

افسروں میں سے کسی کے بھی پاس ریڈیو نہیں تھا۔ ہم سب سے ریڈیو، گھڑیاں، انگوٹھیاں اور دیگر قیمتی اشیاء جانگسری کیمپ (آسام) میں لے لی گئی تھیں۔ خبریں سنوانے کیلئے کیمپ کے مختلف حصوں میں لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے تھے، جن سے صرف آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی کی خبریں سنوائی جاتی تھیں۔

اس کیمپ میں آمد کے دوسرے دن گروپ کمانڈنٹ کرنل موجدار ہم سے ملنے کے لئے آیا، اور دوپہر کا کھانا بھی ہمارے ہی ساتھ کھا کر گیا۔ یہ نہایت چالاک اور مکار ہندو تھا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات اور مزید تجربے سے منکشف ہوا۔ یہاں پر اگر میں میجر یحییٰ حمید کا ذکر نہ کروں تو ناانصافی ہوگی۔ میجر یحییٰ حمید ۴ پنجاب رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے اور اس یونٹ کے ساتھ جنگی قیدی بن کر اس کیمپ میں آئے تھے۔ کیمپ میں قیام کے دوران جس طرح سے میجر یحییٰ نے افسروں کا اور خاص طور سے جونیئر افسروں کا خیال رکھا، الفاظ میں بیان کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ میجر صاحب کو اکثر اپنے ہاتھوں سالن اور روٹیاں پکاتے دیکھا گیا۔ خود اُس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک یہ یقین نہ کر لیتے کہ تمام نوجوان افسروں نے کھانا کھا لیا ہے۔ مختلف طریقوں سے افسروں کا دل بہلانے کی کوشش کرتے رہتے۔ میجر یحییٰ نے آ کر ہمارا غم بالکل مٹا تو نہیں دیا، مگر ہلکا ضرور کر دیا تھا۔ اس سے ہم صحت مند طریقے

سے سوچنے کے قابل ہو گئے تھے۔

تین چار دنوں کے قیام کے بعد ایک بار پھر اپنا سامان سمیٹا اور عازم سفر ہوئے مگر اس بار سفر لمبا نہیں بلکہ ایک قید خانے (کیمپ) سے دوسرے قید خانے تک تھا۔ صبح تقریباً نو بجے ہمارے لئے گاڑیاں آگئیں، ہم ان میں سوار ہو کر روانہ ہوئے اور چند منٹوں میں اس قیدی کیمپ میں پہنچ گئے۔ جہاں ہمیں مستقل طور پر رہنا تھا۔ کیمپ میں داخل ہونے سے پہلے ایک بار پھر تلاشی کے بے معنی مراحل سے گزرنا پڑا۔ مقصد تھا تو صرف یہ کہ ہمیں پریشان کیا جائے اور ہمیں یہ احساس دلایا جائے کہ ہم قیدی ہیں۔

افسروں کے لئے دو لمبی بارکیں تھیں۔ ایک بارک کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصّہ سینئر افسروں کے لئے تھا، دوسرے حصے کو تفریحی کمرہ RECREATION ROOM اور تیسرے حصے کو ڈائننگ ہال بنایا گیا، چوتھا حصّہ ہمارے اردلیوں کے لئے تھا، پانچواں حصّہ باورچی خانہ اور چھٹا سٹور روم بنایا گیا۔ دوسری بارک کو صرف دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ایک حصے میں ایک دیوار کھڑی کر کے اس کے دو حصّے کر دیئے گئے تھے۔

ایک حصّہ آٹھ فٹ لمبا تھا جس میں لکڑیوں اور موم جامے سے پانچ غسلخانے بنائے گئے تھے۔ ہر ایک میں ایک نلکا تھا۔ دوسرے حصے میں ۳۴ افسر رہتے تھے۔

دوسری بارک کے لئے باہر عارضی غسلخانے بنائے گئے تھے اور ساتھ ہی گہری خندق والا DEEP TRENCH LATRINE بیت الخلا بنایا گیا جس کے لئے غالباً کسی سکھ نے جگہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ ہوا کے رخ کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس قدر بدبو آتی تھی کہ بارک کے اندر بیٹھنا دو بھر ہو جاتا تھا۔

ہندوستانیوں سے شکایت کا انہوں نے عہد و پیمان کے سوا کوئی کارروائی نہ کی۔ کچھ وقت گذرا تو ہمارے سونگھنے کی حس ختم ہو گئی۔ پھر ہمیں کبھی ہندوستانیوں سے شکایت نہ ہوئی۔

فرار میرا عزم اور ایمان تھا

اس قید خانے میں دوسری جگہوں کے مقابلے میں حفاظتی انتظامات بہت ہی سخت تھے۔ پہلے کیمپ کی طرح خاردار تاروں کی تین قطاریں تھیں ولیکن ایک ایک سو گز کے بجائے پچاس پچاس گز کے فاصلے پر واچ ٹاور بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک پر سرچ لائٹ بھی تھی، بوقت ضرورت انہیں روشن کر کے رات کو چیونٹی کو بھی حرکت کرتے دیکھا جا سکتا تھا۔ ان کے علاوہ ہر بیس گز بعد ایک ٹیوب لائٹ تھی۔ رات کے وقت خاردار تاروں کے درمیان جو گیریاں تھیں، ان میں سنتریوں کے ساتھ ہو گیر اور خونخوار کتّے بھی گشت کرتے تھے۔

چار مہینوں تک افسروں کو ان کی گھڑیاں اور ریڈیو ٹرانسسٹر نہ دیئے گئے۔ لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے ہندوستانی اپنے مطلب کی خبریں سناتے تھے اور کچھ وقت کے لئے موسیقی کا پروگرام بھی سنایا جاتا تھا— میں نے اس اصل کیمپ میں آتے ہی پرائیویٹ کپڑوں کا ایک جوڑا اور وہ ہندوستانی روپے جو مشرقی پاکستان میں پاکستانی روپوں کے بدلے حاصل کئے تھے پلاسٹک کی ایک تھیلی میں بند کر کے زمین میں دبا دیئے۔ میں نے کرنسی نوٹ ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب اور ایک ہیر کریم کی بوتل میں چھپا رکھے تھے اس لئے ہر تلاشی پر محفوظ رہے۔ اب ان کے ساتھ پرائیویٹ کپڑوں کا ایک جوڑا بھی محفوظ کر لیا جس سے یہ فائدہ ہوا کہ یہ کپڑے POW کی مہر لگنے سے بچ گئے۔ مجھے فرار کے لئے ان کپڑوں کی ضرورت تھی۔

فرار کے لئے سرنگ کی کھدائی اور فرار کی روئیداد سنانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کیمپ کی انتظامیہ وغیرہ کے متعلق کچھ عرض کر دوں تاکہ بعد کے واقعات سمجھنے میں آپ کو آسانی ہو۔ انتظامیہ دو طرح کی تھی۔ ایک گروہ حفاظتی انتظامات کا ذمہ دار تھا اور دوسرا کیمپ کے اندرونی انتظامات وغیرہ کا ذمہ دار۔ حفاظتی ذمہ داری والے لوگوں کے ساتھ ہمارا یعنی قیدیوں کا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ لوگ بدلتے رہتے تھے۔ مثلاً کبھی راجپوت

رجمنٹ کی کمپنی آجاتی کبھی مہار رجمنٹ کی اور کبھی گورکھا رجمنٹ کی کمپنی آجاتی تھی۔ اندرونی انتظامات کیمپ کے لوگ ایک حد تک مستقل تھے۔ ان کا انچارج ایک کرنل تھا۔ ہمارے کیمپ کا سٹاف یہ تھا۔

گروپ کمانڈنٹ	کرنل موجدار
کیمپ کمانڈنٹ	میجر جی۔ ایس۔ بی۔ سنگھ
کیمپ ایجوٹینٹ	کیپٹن جسوال
کیمپ کوارٹر ماسٹر	کیپٹن موزے
کیمپ میڈیکل آفیسر	میجر دھرم پال
کیمپ حوالدار میجر	حوالدار لوکر سنگھ
کیمپ کوارٹر ماسٹر حوالدار	حوالدار جے پال

کرنل موجدار بظاہر مخلص اور خلیق تھا۔ ہنستے رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن پکا اور انتہائی قسم کا متعصب ہندو تھا اور ہر طریقے سے ہمیں تنگ کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ کوارٹر ماسٹر اور دونوں حوالدار قدرے بہتر اور معقول انسان تھے۔ کیمپ ایجوٹینٹ، کیپٹن جسوال نہایت متعصب، مکار اور عیار تھا۔ ہمیں پریشان کرنے کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتا تھا۔ مگر اسے کامیابی کم ہی نصیب ہوتی تھی کیونکہ ہم اس کی حرکتوں کو قبل از وقت بھانپ لیتے اور ایسا سدِباب کر لیتے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

کیمپ میں ہمارا روزمرہ معمول یہ تھا کہ صبح چھ بجے گنتی کے لئے "فال ان" ہوتے۔ ڈیوٹی آفیسر گنتی کر کے تسلی کر لیتا کہ رات کو کوئی بھاگ نہیں گیا۔ اس کے بعد وہ بارک، غسلخانوں اور بیت الخلا کا معائنہ کر کے چلا جاتا اور ہم اپنے طور پر پی ٹی (ورزش) کرتے تاکہ جسم صحت مند اور چست رہیں۔ اس کے بعد ناشتہ اور ناشتے کے بعد ہم لوگ گپ شپ، مختلف مسائل اور موضوعات پر تبادلۂ خیالات، تاش اور شطرنج وغیرہ میں مصروف ہو جاتے۔ کچھ عرصہ بعد ہندوستانیوں نے ہمیں اخبار دینے شروع کر دیئے اور کیمپ میں چھوٹی سی ایک لائبریری بھی بنا دی گئی تھی۔ پینٹنگ (مصوری) کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔ ان انتظامات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ تر

وقت اخبار اور کتابیں پڑھنے میں صرف ہونے لگا اور جن افسروں کو پینٹنگ کا شوق تھا وہ اس سے دل بہلاتے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اگر کوئی افسر کوئی تصویر مکمل کر لیتا تو وہ ہندوستانی اٹھا لے جاتے۔

دوپہر کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا جاتا۔ شام کو ہم والی بال اور ٹیبل ٹینس کھیلتے تھے اور رات کو بستر میں لیٹ کر سونے کی ناکام کوشش کرتے۔ جسموں کو تو ہم صحت مند رکھ سکتے تھے لیکن روح جس اذیت میں مبتلا تھی اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ جذباتی لحاظ سے ہم میں سے کوئی بھی صحت مند نہیں تھا۔ میرے پاس اس کا ایک ہی علاج تھا۔ فرار، فرار، فرار۔ ہندو کی قید سے فرار۔ یہ میرا عزم تھا، یہ میرا ایمان تھا۔

رُوح علیل تھی

پھر ہندوستان نے ہمیں ایک ڈھولک اور ایک ہارمونیم دے دیا۔ یہ ایک مذاق تھا، مگر میجر یحییٰ جن کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، اس مذاق سے بھی فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہمارے یہ میجر صاحب ہر فن مولا تھے۔ کھانا پکاتے، کپڑے سی لیتے، اُون کا کام بھی کرتے تھے اور انکشاف ہوا کہ وہ ہارمونیم اور ڈھولک بجانا بھی جانتے ہیں۔ ان اوصاف کے علاوہ میجر یحییٰ اچھے خاصے شاعر اور دو ناولوں کے مصنف بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ ناولوں کے نام میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہے۔ اسیری کے دوران ایک اور ناول لکھ رہے تھے معلوم نہیں یہاں آ کر شائع کرا سکے ہیں یا نہیں۔

رات کو دوسری بارک جس میں ۳۴ افسر تھے، کے کچھ افسر ایک جگہ جمع ہو جاتے۔ میجر یحییٰ ہارمونیم پر کلاسیکی موسیقی سے حاضرین کو محظوظ کرتے۔ ڈھولک پر سنگت کیپٹن کرم خان کرتے تھے۔ اس فن میں کیپٹن کرم خان کو مہارت حاصل تھی۔ کیپٹن ظفر کو خدا نے سُریلی اور پُرسوز آواز سے نوازا تھا۔ وہ محفل میں خوب رنگ جماتے۔ موسیقی کی مدھر تانوں میں ہم ماضی اور حال کو فراموش کر دیا کرتے تھے مگر یہ کیفیت عارضی ہوتی تھی۔ محفل بکھر جاتی

اور ہم جب سونے کے لئے لیٹتے تو حقائق کی تلخیاں ذہن کو قبضے میں لے لیتیں۔ جگہ پاتیں واقعات جو گزر چکے تھے اور حادثہ جو گزر رہا تھا، نیند حرام کر دیتا۔ میں اپنی جذباتی کیفیت بیان کرتے میں کوئی عار محسوس نہیں کروں گا۔ میرے آنسو نکل آتے تھے۔ کئی راتیں روتے گزری ہیں۔ فوجی رویا نہیں کرتے۔ شکست کھا کر بھی سپاہی کے آنسو نہیں نکلا کرتے مگر ہماری شکست کی نوعیت اور اس کے اسباب ایسے تھے کہ اشکوں پر ہمیں کچھ اختیار نہ رہا۔ اس شکست کے ذمہ دار ہم نہیں تھے۔ ہم تو لڑتے ہوئے مرنے کا عزم کر چکے تھے۔

روزمرہ معمول میں شام کی گنتی بھی شامل تھی۔ شام کو بھی ہمیں گنتی کے لئے فال ان کیا جاتا اور ڈیوٹی آفیسر گنتی کر کے بارک، غسل خانوں اور بیت الخلا کو اچھی طرح دیکھ کر چلا جاتا۔ یہ معائنہ ناگہانی اور اچانک بھی ہوتا تھا۔

بارک میں ہر افسر کے لئے ایک چارپائی اور چھوٹی سی ایک الماری تھی۔ تین چار افسروں میں صرف ایک کرسی تھی۔ بارک خستہ حالت میں تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کواڑ ٹوٹے ہوئے تھے۔ انہیں مرمت کرا دیا گیا تھا پھر بھی کئی ایک کھڑکیوں کی چٹخنیاں غائب تھیں۔ ان تمام بارکوں کی حالت بتاتی تھی کہ انہیں ناقابلِ استعمال ہونے کی وجہ سے مسمار کرنے کے احکام جاری ہو چکے ہوں گے۔ مگر ہندوستان کو انہیں کچھ عرصہ اور استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ بارک میں ایک بھی پنکھا نہیں تھا۔ چھت ٹین کی تھی جو سردیوں میں بارک کو بہت سرد اور گرمیوں میں تنور بنا دیتی تھی۔ دیواروں پر سفیدی کے آثارِ قدیمہ کا ذرا ذرا پتہ ملتا تھا۔ فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔

مشرقی پاکستان میں ہمارے پاس اپنی فوج کے جو اردلی تھے وہی ہمیں اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس سے ہمیں بہت سہولت ہو گئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی عادات اور ضروریات سے اچھی طرح واقف تھے۔ قیدی کیمپ میں اردلی اور افسر میں اُنس اور ہمدردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اپنے اردلی محمد حنیف کو ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔ اس نے مشرقی پاکستان کے میدانِ کربلا میں اور اسیری میں جس خلوص اور پیار سے میرا ساتھ دیا اور میرے آرام وغیرہ کا خیال رکھا وہ ایک اردلی کا نہیں ایک بھائی کا پیار اور خلوص تھا۔

میری دعا ہے کہ وہ خیریت سے پاکستان آگیا ہو اور جہاں بھی ہو خوش اور مطمئن ہو۔

پورے کیمپ کی ایک سنٹرل کنٹین بھی تھی۔ جس میں نہانے اور کپڑے دھونے کا صابن، دانتوں کے برش اور پیسٹ، شیونگ کریم اور برش، انڈرویئر بنیان، بلیڈ اور سگریٹ وغیرہ مل جاتے تھے۔ کبھی کبھار کنٹین میں اچار، مربہ، جام، مکھن اور بسکٹ بھی آجاتے تھے مگر اتنی کم مقدار میں کہ نہ ہوتے تو بہتر تھا۔ یہ اشیاء اکثر گھٹیا قسم کی ہوتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ بازار میں فروخت نہیں ہو سکیں، اور انہیں قیدیوں میں کھپانے کے لئے لے آئے ہیں۔ ان کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی تھیں۔ ہم مجبوراً گھٹیا چیزیں ہندوستانیوں کے منہ مانگے داموں خریدتے تھے۔

سب سے زیادہ پریشانی سگریٹ نوشی کے عادی افسروں کو ہوئی وہ اعلیٰ قسم کے سگریٹ پینے کے عادی تھے مگر کنٹین میں نہایت گھٹیا قسم کے سگریٹ اور بیڑیاں رکھی گئیں مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ سگریٹ نوشی کس قدر مکروہ عادت ہے۔ انسان کو ذلیل کر دیتی ہے۔ اپنی پسند کے سگریٹ نہ ملنے کی وجہ سے سگریٹ نوشوں کو ایسی اذیت سے دوچار ہونا پڑا جو صرف جسمانی نہیں ذہنی بھی تھی۔ ان لوگوں نے آخر بڑے ہی گھٹیا سگریٹ اور بیڑیاں پینی شروع کر دیں۔ کچھ عرصہ بعد مسلسل شکایت کرنے سے اچھے سگریٹ آنے لگے لیکن اس قدر کم کہ شکایت کا ازالہ نہ ہو سکا اور افسر گھٹیا سگریٹوں کے عادی ہو گئے۔

ہمیں راشن کچا دے دیا جاتا تھا۔ پکانے کا انتظام ہمارا اپنا تھا۔ یہ راشن ہمیں ہندوستانی سپاہی کے سکیل کے مطابق ملتا تھا۔ گوشت ہفتے میں دو بار آتا تھا۔ ہم نے اس شک کی بنا پر کہ یہ جھٹکا ہو سکتا ہے اعتراض کیا کہ ہمیں زندہ [illegible] ملنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں ہندوستانی ایک مسلمان کو ساتھ لے آئے جس نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے بکرا ذبح کرتا اور گوشت بنا کر سپلائی کرتا ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ یہ گوشت حلال ہے۔ گھی بہت کم ملتا تھا۔ ہندوستانی کہتے تھے کہ ان کے راشن سکیل میں گھی اتنا ہی ملتا ہے۔ ہمارے مطالبے پر کنٹین میں گھی آنے لگا، جو ہم قیمتاً خریدتے اور اپنی ضرورت پوری کرتے تھے۔

اشیاء خریدنے کے لئے کوپن کرنسی چلتی تھی۔ یہ ہمیں جنیوا کنونشن کے تحت سیکنڈ لیفٹیننٹ

سے کیپٹن تک ۹۲/- روپے میجر اور لیفٹیننٹ کرنل کو ۱۱۱/- روپے ماہوار ملتی تھی۔ یہ جیب خرچ تھا جو سگریٹ نہ پینے والوں کے لئے کافی تھا — ابتدا میں ہمیں باورچی خانے کے لئے جو لکڑیاں ملتی تھیں وہ اس قدر گیلی ہوتی تھیں کہ انہیں جلانا ناممکن تھا۔ یقین کیجئے کہ اکثر اوقات کھانا نہیں پکتا تھا اور ہم بھوکے رہتے تھے۔ ہم بھوک برداشت کر سکتے تھے مشرقی پاکستان کے میدان جنگ میں ہم نے اس سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا خندہ پیشانی اور قومی جذبے سے کیا تھا۔ مگر قیدی کیمپ میں ہندو اپنی مسلم آزار ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں جن طریقوں سے پریشان کر رہے تھے وہ ناقابل برداشت تھے۔ یہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ خود تصور کریں کہ ہماری جذباتی حالت کیا ہوتی ہوگی۔

کیک میں ریوالور

راشن میں ہمیں دودھ بھی ملتا تھا جو سب کچھ ہو سکتا تھا۔ دودھ نہیں تھا۔ اکثر پھٹ جاتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شاید دودھ ہی تھا۔ ہم دودھ کے بغیر چائے پینے کے عادی ہو گئے تھے۔ دن میں تین بار چائے ملتی تھی۔ سالن کے لئے مرچ مصالحے اتنا کم ہوتا تھا کہ سالن کا کوئی ذائقہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہمارے باورچیوں کا کمال تھا کہ سالن میں اتنا سا ذائقہ پیدا کر لیتے تھے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ سالن نہیں ہے۔ میں اپنے باورچیوں اور اردلیوں کو دل کی گہرائیوں سے خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ ہمارے ساتھ وہ ہر آزمائش میں پورے اترے اور انہوں نے ہر کام جانفشانی سے کیا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ہمیں مختلف اخبار بھی دیئے جاتے تھے۔ یہ اخبار ہمارے ذوق کی تسکین کی خاطر یا ہماری ضرورت پوری کرنے کے لئے نہیں دیئے جاتے بلکہ یہ سرکاری قسم کے اخبار تھے جن میں اندرا کی حکومت کی مدح سرائی اور بھارت ماتا کی برتری کے چرچے ہوتے تھے۔ یہی پروپیگنڈہ ہمارے ذہنوں میں ڈالنا مقصود تھا تاہم کچھ خبریں پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ یہی حال اس چھوٹی سی لائبریری کا تھا،

جو ہمارے لئے کھولی گئی تھی۔ اس میں ہمارے مطلب اور ذوق کی ایک بھی کتاب نہیں تھی۔ البتہ ہم پڑھنے کی خاطر پڑھتے رہتے تھے۔ ان میں ایک کتاب کام کی تھی جس کا نام تھا THE PRISONERS OF MENZ

یہ اتحادی افواج کے ان افسروں کے بارے میں تھی جو دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں کے جنگی قیدی بن گئے تھے۔ انہیں جرمنی کے شہر میں رکھا گیا تھا۔ اس کتاب نے ہمیں فرار میں تو کوئی مدد نہ دی، البتہ جنگی قیدی کی نفسیات سے ہم واقف ہو گئے۔ نفسیات سے تو ہم عملی طور پر واقف ہو ہی گئے تھے۔ اس کتاب نے ہمیں یہ بتایا کہ جنگی قیدی بن کر جو نفسیاتی خلفشار اور جذباتی گھٹن پیدا ہوتی ہے اس پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب نے یہ انکشاف بھی کیا کہ جرمنوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا انہیں ہر قسم کی سہولت مہیا کی تھی۔ یہاں تک کہ قیدیوں کے لئے ان کے لواحقین کی طرف سے جو پارسل آتے تھے ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ پابندی نہ ہونے کا نتیجہ تھا کہ بعض قیدیوں کو تحفے کے طور پر بڑے سائز کے کیک ملے۔ ان کیکوں میں سے ریوالور نکلے، اور تاریں کاٹنے کے اوزار بھی۔ جرمنوں نے بغیر چیک کئے یہ پارسل قیدیوں کو دے دیئے۔ ان واقعات میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کتاب کا مصنف ایک برطانوی کپتان ہے جو اس کیمپ میں خود جنگی قیدی تھا۔

جو میں نے یہ کتاب پڑھی تو میں اکثر دعا کرنے لگا کہ ہمارے بھی کسی رشتہ دار یا دوست کو خیال آ جائے تو وہ ریوالور نہیں تو تار کاٹنے کے اوزار ہی بھیج دے۔ ہمیں وہاں کیکوں کی نہیں تاریں کاٹنے کے اوزار ہی کی ضرورت تھی۔

یہ کتاب پڑھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ نازی جرمنوں اور ہندوستانیوں کی ذہنیت میں زمین اور آسمان جتنا فرق ہے، حالانکہ جرمنوں پر درندگی اور بربریت کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں فرار کے متعلق ہمیں یہی کچھ معلوم ہوا کہ ایک کرنل نے فرار کی چار بار کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک بار وہ دھوبی کے ٹرک میں گندے کپڑوں میں چھپ کر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بڑے گیٹ کے سنتری نے کپڑوں کی تلاشی لی اور

کرنل کو پکڑ لیا۔ ایک بار اس نے کمبلوں کو لمبے ٹکڑوں میں پھاڑ کر رسہ بنایا اور بالائی منزل کی کھڑکی سے اتر گیا۔ وہ زمین سے دو ہاتھ ہی اوپر رہ گیا تھا کہ جرمن سنتری آ گیا اور اس نے کرنل سے پوچھا۔ "محترم کرنل! کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟" مختصر یہ کہ یہ کرنل ہر بار رنگے ہاتھوں پکڑا گیا، مگر اس نے اپنے اس حق اور فرض کا پورا استعمال کیا کہ جنگی قیدی دشمن کی قید سے فرار ہونے کا حق رکھتا ہے۔

کچھ کتابیں فوجی تاریخ کے متعلق تھیں اور باقی سب لادینیت اور ہندوستانی جمہوریت نما آمریت کی علمبردار تھیں۔ انہیں دیکھنے سے ہی نفرت پیدا ہوتی تھی۔ ان میں وہ کتابیں بھی تھیں جو انہی دنوں ۱۹۷۱ء کی جنگ کے متعلق لکھی گئی تھیں ان میں تین

PAKISTAN CUT TO SIZE
THE RAPE OF BANGLA DESH
THE LIGHTENING CAMPAIGN

ہماری لائبریری میں رکھی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے۔ جن پاکستانیوں نے یہ کتابیں پڑھی ہیں انہیں ان کے مندرجات پر یقین آ گیا ہو۔ ہندوستانی عوام نے تو یقیناً انہیں سچی داستانیں سمجھا ہو گا مگر ہم یعنی پاک فوج کے افسر اور جوان جو ان کتابوں کے مرکزی کردار تھے، بتا سکتے ہیں کہ ان کتابوں میں کس ڈھٹائی سے جھوٹ بولے گئے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ کے وہ سب سے بڑے دروغ گو، یورپ کا میکاولی اور جرمنی کا گوئبلز بھی اتنا زیادہ اور اس نوعیت کا جھوٹ نہیں بول سکے تھے۔

کیمپ میں مہینے میں دو تین بار فلم دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چھوٹے سائز کی سکرین لگائی گئی تھی پہلی فلم دستاویزی تھی، جو مرزا غالب کی سوانح حیات تھی مگر اس قدر پرانی تھی کہ کچھ نظر آئی کچھ نہ آئی۔ اس کے بعد ہندوستانی فلمیں دکھاتے رہے جو بجلی کی کمزوری کی وجہ سے کچھ اس طرح دیکھی گئیں کہ تصویر ہے تو آواز نہیں، آواز ہے تو تصویر نہیں اور اگر دونوں ہیں تو تصویر دھندلی اور آواز دھیمی بہر حال یہ بھی ایک شغل تھا جس سے ہم ہر ماہ دو تین بار دل بہلا لیتے تھے۔

دل بہلانے اور جلانے کے ڈھنگ

افسر اپنی وردیاں اور بستر مشرقی پاکستان سے ساتھ لائے تھے۔ مشکل ان کے لئے پیدا ہوئی جو سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے ہی زخمی حالت میں پکڑے گئے تھے۔ انہیں ہندوستانیوں نے ایک رضائی دے دی تھی۔ ان کے علاوہ خاکی وردی، جراب، بنیان اور انڈرویئر بھی دیئے تھے۔ مگر جو کپڑا پھٹ جاتا اسے بدلوانا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا تھا۔ پرائیویٹ کپڑوں کی ضرورت شدید تھی۔ افسروں نے ایک ایک شلوار یا پاجامے پر دس دس پیوند لگا رکھے تھے۔ پاکستان سے پارسل آنے لگے تو یہ ضرورت پوری ہو گئی۔

ہندوستانیوں کی ہر حرکت دلچسپ ہوتی تھی مگر جوتوں کے معاملے میں انہوں نے نہایت دلچسپ طریقے سے پریشان کیا۔ ہمیں کینوس شوز اور کھلے چپل کا ایک ایک جوڑا دیا گیا۔ مگر ساتھ یہ حکم دیا گیا کہ بوٹوں اور شوز کے تسمے نکال کر جمع کرا دیئے جائیں۔ ہمیں تسموں سے محروم کرنے کی وجہ معلوم نہیں کیا تھی۔ شاید یہ ہو گی کہ ہم تسموں سے کسی ہندوستانی افسر کو باندھ کر یرغمال نہ بنا لیں یا شاید یہ وجہ ہو کہ تسموں کے ذریعے فرار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ بہر حال تسموں کے بغیر بوٹ اور شوز پہننا مشکل تھا، اس لئے ہم نے چپل پہننے شروع کر دیئے۔ ہندوستانی شاید یہی چاہتے تھے کہ ہم کھلے چپل پہنیں تاکہ فرار میں ہم تیز نہ چل سکیں۔ کچھ عرصہ بعد ہندوستانیوں کو خود ہی شرم آ گئی اور انہوں نے ہمیں تسمے واپس کر دیئے۔

انسانی ضروریات ایسی ہیں جن میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر طبی ضرورت کو سب پر اولیت اور اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان کے قیدی کیمپوں میں اس ضرورت کو بے دردی سے نظر انداز کیا گیا تھا۔ ہمارے پورے کیمپ میں صرف ایک

میڈیکل انسپکشن روم تھا۔ فوج میں اسے ایم۔آئی۔روم اور سول میں ڈسپنسری کہتے ہیں۔ اس کا انچارج ایک ہندوستانی میڈیکل آفیسر تھا۔ اس کے ساتھ، بلکہ اس کے ماتحت، پاک فوج کے دو ڈاکٹر (قیدی) تھے۔ ان کی مدد کے لئے ہمارے ہی ڈریسنگ اور نرسنگ سپاہی تھے۔ ہمارے ڈاکٹر اور نرسنگ سپاہی صبح سویرے بھاری گارد کے تحت ایم۔آئی روم جاتے اور سات بجے سے شام چار بجے تک کام کرتے تھے۔

کوئی قیدی بیمار ہوتا، اور چلنے کے قابل ہوتا تو اسے بھاری گارد کے ساتھ ایم۔آئی۔روم لے جایا جاتا اور دوائی وغیرہ لے کر اسے لایا جاتا۔ اگر کوئی بیمار چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوتا، اسے ڈاکٹر خود ہی دیکھنے آجاتا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ ڈاکٹر پاکستانی ہوتا تھا۔ ہندوستانی ڈاکٹر کسی پاکستانی بیمار کو دیکھنے نہیں آیا کرتا تھا۔ ہمارے اپنے ڈاکٹروں نے جس جانفشانی اور خلوص سے اپنے لوگوں کی دیکھ بھال کی وہ قابلِ فخر مثال ہے جسے کوئی بھی سابقہ جنگی قیدی فراموش نہیں کر سکے گا۔ مگر ان کی سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ انہیں کام کی کوئی دوائی نہیں ملتی تھی۔ ایم آئی۔روم میں نہایت معمولی سی دوائیاں مثلاً عام سی قسم کا مکسچر اور اے۔پی۔سی کی گولیاں رکھی گئی تھیں۔

کسی کا مرض کیسا ہی شدید اور کیسی ہی قیمتی دوائی کا متقاضی کیوں نہ تھا، اسے انہی عام سی دوائیوں پر ٹرخا دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے پاس پیسے ہوتے تھے، مگر ان سے وہ دوائی نہیں خرید سکتے تھے کیونکہ باہر سے دوائی منگوانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کیمپ کے افسروں، خصوصاً میڈیکل افسروں کو اوپر سے حکم ملا تھا کہ پاکستانیوں کو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے اتنا نقصان پہنچایا جائے کہ پاکستان میں جا کر بھی یہ صحت یاب نہ ہو سکیں۔

ہندوؤں کے رویے کو واضح کرنے کے لئے ایک ہی مثال کافی ہو گی میجر اکرم جنگ میں شدید زخمی ہو گئے تھے اور سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے ہی دشمن کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔ انہیں ہسپتال میں رہنا چاہیئے تھا، مگر انہیں کیمپ میں رکھا گیا۔ ہر روز انہیں فوجی گاڑی میں ایم۔آئی۔روم لے جایا جاتا

تھا اور انکے ساتھ سات مسلح جوانوں کی گارد ہوتی تھی۔ یہ لگتا تو عجیب ہے کہ ایسے معذور زخمی کے ساتھ آدھی درجن سے زیادہ مسلح گارد ہو لیکن غور فرمائیں تو واضح ہو گا کہ ہندوؤں پر پاکستانی فوج کی جو دہشت طاری ہے وہ ان کے ذہن لاشعور میں اُتری ہوئی ہے۔ ہم پر فتح پا لینے کے باوجود وہ ہمارے زخمیوں سے بھی ڈرتے تھے۔

ہمیں ملیریا اور ہیضہ کے انجکشن لگتے تھے۔ ہمارا وزن بھی ریکارڈ کیا جاتا تھا اور ہمارے خون سے گروپ معلوم کر کے ہمارے شناختی کارڈوں پر درج کر دیئے گئے تھے۔

کیمپ میں ڈیڑھ ماہ تک نہ کسی کو باہر سے خط ملا نہ ہمیں خط لکھنے کے لئے کارڈ لفافے دیئے گئے۔ کیمپ میں پہلا خط ہمارے ایک ساتھی افسر کے نام کینیڈا سے آیا۔ ہم نے اُسے مبارک باد دی۔ اس دلی اطمینان اور روحانی مسرت کا اندازہ ایک جنگی قیدی ہی کر سکتا ہے، جو قیدی کیمپ میں خط ملنے سے حاصل ہوتی تھی ...... دو ماہ بعد پاکستان سے خطوط آنے لگے اور ہمیں چھ کارڈ اور چار لفافے ماہوار اپنے عزیزوں کو لکھنے کے لئے ملنے لگے۔ آنے اور جانے والے خطوط سنسر ہوتے تھے، جس سے دونوں طرف کی ڈاک میں خاصی تاخیر ہو جاتی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان سے آئے ہوئے ایک خط کو کیمپ تک پہنچتے دو سے اڑھائی مہینے لگتے تھے۔ اسی رفتار سے ہمارے خطوط پاکستان تک پہنچتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد کیمپ آرڈرز میں کہا گیا کہ قیدیوں کے بہترین ڈسپلن کے پیشِ نظر انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے ان رشتہ داروں اور دوستوں کو خطوط لکھ سکتے ہیں جو ہندوستان میں مقیم ہیں، اور ایک کیمپ سے کسی بھی دوسرے کیمپ کے دوستوں کو خطوط لکھے جا سکتے ہیں۔ ہم نے ہندوستانیوں کی اس کرم نوازی پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستانی ہمارے اُن رشتہ داروں کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں مقیم ہیں، اور وہ انہیں ہمارے متعلق ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر انہیں اور ہمیں پاکستان کے خلاف استعمال کریں گے۔ یہ سوچ کر کم از کم ہمارے کیمپ کے کسی بھی افسر نے ہندوستان

میں اپنے کسی عزیز کو خط نہ لکھا۔

ابتداء میں جنگی قیدیوں کو کوئی تحفہ نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ کوئی کتاب یا رسالہ تک بھیجنے کی اجازت نہیں تھی۔ بعض تنظیموں اور اداروں نے کتابیں اور رسالے بھیجنے کی اجازت مانگی تھی۔ جو ہندوستانیوں نے نہیں دی کچھ عرصے بعد محدود تعداد میں تحفوں کے پارسل وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

ہمارے دھوبی، حجام اور بھنگی وہی تھے جو مشرقی پاکستان میں ہمارے ساتھ تھے، دھوبی اندر ہی ہمارے کپڑے دھوتا تھا مگر اسے صابن اور استری کیلئے کوئلہ بہت ہی کم مقدار میں دیا جاتا تھا۔ کرنل موجمدار سے کئی بار کہا گیا کہ وہ ہماری یہ ضرورت پوری کرے لیکن میرے فرار تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تھا نہ حل ہونے کی توقع تھی۔

ہمارا حجام ایک دلچسپ شخصیت تھا۔ اس کا نام تخیر گل تھا۔ مشرقی پاکستان میں وہ ۱۴ پنجاب رجمنٹ کے ساتھ تھا اور اسی رجمنٹ کے ساتھ جنگی قید میں آ گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ جاپانیوں کا جنگی قیدی رہا تھا۔ وہ جب بھی کسی افسر کے بال کاٹتا تو جاپان میں کاٹی ہوئی جنگی قید کے بڑے دلچسپ قصے سنایا کرتا تھا۔ اس کی عمر پچپن سال ہو گئی تھی مگر اس نے بڑھاپے کو قبول نہیں کیا تھا۔ ہر لمحہ مستعد رہتا۔ اس کے چہرے پر ہم نے کبھی تھکن یا اکتاہٹ کے تاثرات نہیں دیکھے۔

میں کیمپ کی انتظامیہ کا ڈھانچہ پچھلے صفحات میں بیان کر آیا ہوں۔ کیمپ کا سب سے بڑا افسر کرنل موجمدار تھا۔ وہ فتح گڑھ کا سٹیشن کمانڈر بھی تھا۔ جس طرح کیمپ کی انتظامیہ کی مختلف ذمہ داریاں مختلف افسروں کے سپرد تھیں، اسی طرح ہمارے سینیئر افسروں نے بھی ذمہ داریاں قیدی افسروں کو سونپ رکھی تھیں۔ یہ اقدام ڈسپلن اور یکجہتی قائم رکھنے کے لئے کیا گیا تھا۔ مثلاً ہم میں ایجوٹینٹ بھی تھا۔ میس سیکرٹری اور لائبریری انچارج بھی مقرر کئے گئے تھے۔

ہندوستانی ہمیں جو احکام دینا چاہتے وہ کیمپ آرڈرز میں تحریری طور پر آ جاتے تھے۔ اگر احکام زبانی آتے تو ہمارے سینیئر افسر کی معرفت ہمیں ملتے تھے۔ اور کوئی بہت

ضروری اور فوری طور پر حکم دینا ہو تو کیمپ کمانڈنٹ یا ایجوٹینٹ بارک میں آ کر تمام افسروں کو اکٹھا کرتا اور حکم سناتا تھا۔ اور ہم جو بات کیمپ کے افسروں تک پہنچانا چاہتے وہ اپنے سینیئر افسر کے توسط سے پہنچاتے تھے۔ ہمارے سینیئر افسر کرنل عبدالحفیظ تھے جو ٹھنڈے دل سے سوچنے والے انسان تھے اور ان کی شخصیت میں توازن تھا۔ ان میں تدبر اتنا تھا کہ بات سنتے، غور کرتے اور کسی کی دل آزاری کئے بغیر مسئلہ حل کر دیتے۔ یہ انہی کی شخصیت کا اثر تھا کہ کیمپ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ اور انہوں نے کوئی ایسی صورت بھی پیدا نہ ہونے دی جس سے ہندوستانی ہم پر نا روا زیادتی کرتے۔

ہندو افسر، کتے اور ہماری سرنگ

میں حفاظتی انتظامات بیان کر چکا ہوں۔ وہ ابتدائی انتظامات تھے۔ اس کے بعد انہیں سخت سے سخت تر کیا جانے لگا۔ مثلاً کیمپ کے ارد گرد سرچ لائٹوں اور ٹیوب لائٹوں سے روشنی اس قدر زیادہ کر دی گئی تھی کہ رات کو کوئی اندھیری جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ پہلے واچ ٹاور لکڑی کے تھے۔ انہیں شاید قابل تسخیر سمجھ کر ان کی جگہ لوہے اور سیمنٹ کے ٹاور بنا دیئے گئے۔ ہر ٹاور کی بلندی چالیس فٹ تھی۔ سنتریوں کی تعداد بھی دگنی کر دی گئی۔ ابتدا میں خاردار تاروں کی تین باڑیں تھیں جو پانچ کر دی گئیں۔ یہ حکم جاری کیا گیا کہ تاروں سے تین فٹ سے آگے کوئی نہیں جا سکتا۔ خلاف ورزی کرنے والے کو گولی مار دینے کا حکم دے دیا گیا۔ ایک بار صبح اور ایک بار شام کو گنتی ہوتی تھی۔ پھر رات کو اچانک معائنہ ہونے لگا، اور اس کے بعد رات کو کبھی کبھی دو دو بار چیکنگ کی جانے لگی۔ پہرے میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا۔ خاردار تاروں کی پانچ متوازی باڑوں کے

اندر گھومنے پھرنے والے سنتریوں کی تعداد بڑھا دی گئی۔ کچھ سنتری تاروں کے باہر گشت کرنے کے لئے مقرر کر دیئے گئے، اور کیمپ کے ارد گرد تاروں کے اندر بھی گشتی پہرے کا انتظام کیا گیا۔ یہ پہرے صرف رات کے لئے تھے۔ روشنی کا متبادل انتظام ایک جنریٹر کے ذریعے کر دیا گیا تھا۔ اگر بجلی بند ہو جاتی تو فوراً جنریٹر چلا دیا جاتا اور کیمپ روشن ہو جاتا۔

اس کے علاوہ ڈرانے دھمکانے کا انتظام بھی کیا گیا۔ وہ اس طرح کہ ایک روز ہندوستانی افسر اپنے ساتھ مختلف قسم کے کتے کیمپ میں لائے اور تمام پاکستانی افسروں کو اکٹھا کر لیا۔ ایک افسر ہر ایک کتے کے اوصاف اور کمالات سنانے لگا۔ اس نے کہا کہ ان کتوں کی موجودگی میں آپ لوگ فرار نہیں ہو سکتے۔ اس نے ایک اور کتے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس کتے کی موجودگی میں سرنگ نہیں کھودی جا سکتی، کیونکہ یہ فوراً سرنگ کا پتہ لگا لیتا ہے۔

یہ ہندوستانی افسر اپنے کتے کے کمالات اُس وقت سنا رہا تھا جب ہماری سرنگ چالیس گز دور پہنچ چکی تھی اور یہ سرنگ اس جگہ سے جہاں ہندوستانی افسر اور کتا کھڑے تھے، پندرہ سولہ گز دور تھی۔ دراصل ہندوستانی افسر یہ احمقانہ باتیں اس لئے سنا رہے تھے کہ متعدد قیدی کیمپوں میں فرار کی کوششیں ہو چکی تھیں، پکڑے جانے کے باوجود پاکستانی فرار کی کوششوں میں مصروف تھے۔ بہرحال ہم میں سے کوئی بھی ہندوستانی کتوں سے مرعوب نہیں ہوا۔ اس سے پہلے ہندوستانی افسر آتے تھے، اب کتے آگئے تو کیا فرق پڑتا تھا۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کیمپ کے ہندوستانی افسروں کا رویہ اور سلوک اچھا نہیں تھا بلکہ بعض کا رویہ توہین آمیز ہوتا تھا۔ ان میں کیمپ کے ایجوٹینٹ کیپٹن جسوال کا سلوک تو سب سے زیادہ ہتک آمیز تھا۔ وہ پاکستانی افسروں کو پریشان کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا، لیکن اس کی حرکتوں اور باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ڈرپوک ہے اور پاکستانی افسروں کو اکٹھا کر کے انگریزی میں لمبا چوڑا لیکچر دیا کرتا تھا۔ اس کے لیکچر اس لحاظ سے دلچسپ ہوتے تھے کہ اس کی انگریزی خاصی کمزور اور ناقص تھی۔

AS A MATTER OF FACT اس کا تکیہ کلام تھا۔ ہم نے اس کا نام ہی CAPTAIN AS A MATTER OF FACT رکھ دیا تھا۔ ایک روز اس نے ہمیں حسبِ معمول انگریزی میں لیکچر دیتے ہوئے کہا: "بعض کیمپوں میں قیدیوں نے فرار کے لئے سرنگیں کھودی تھیں، مگر ان کی کوششیں ناکام بنا دی گئیں، کیونکہ ہمارے حفاظتی انتظامات اتنے سخت ہیں کہ فرار ناممکن ہے۔ اس کیمپ میں ہم نے ایسی کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں آپ لوگ سرنگ کھود سکیں۔ اگر آپ میں سے کسی کو یہ توقع ہو کہ وہ سرنگ کھود سکے گا تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ آپ کی ہر ایک حرکت پر ہم شب و روز، ہر لمحہ نظر رکھتے ہیں۔"

وہ یہ لیکچر ہماری کھودی ہوئی اُس سرنگ کے قریب ہی کھڑا دے رہا تھا، جو چالیس گز تک پہنچ گئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کیا جس نے ہمارے جذبے کو قبول فرما کر ہمارے راز پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں ہم جانتے تھے کہ ہمارا حشر کیا ہوگا۔

ایک روز کیپٹن جسوال ہمارے لئے مونگ پھلی اور مٹھائی لایا۔ یہ ہمارے لئے حیران کن تھا۔ معلوم ہوا کہ جب ملک تقسیم ہوا یعنی جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو کیپٹن جسوال کی ماں کوئٹہ رہ گئی تھی۔ اسے اور کیپٹن جسوال کو ایک مسلمان بحفاظت سرحد تک لایا اور ہندوستان پہنچا دیا تھا۔ اس کی ماں کو وہ وقت اور ایک مسلمان کی نیکی یاد تھی۔ اس کے صلے میں اس نے ہمارے لئے مٹھائی اور مونگ پھلی بھیجی اور دعائیں بھی دی تھیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ کیپٹن جسوال نے ہمیں اپنی زبان سے بتایا کہ اسے ماں نے تلقین کی ہے کہ وہ پاکستان کے قیدی افسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ مگر جسوال اصل ہندو تھا اور ہندو ذہنیت کا چلتا پھرتا نمونہ۔ اس سے آپ تصور فرمائیں کہ ہندو کے دل میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر عداوت بھری ہوئی ہے۔

کیمپ کمانڈنٹ میجر ایس۔ بی۔ ایس گل نام کا ایک سکھ افسر تھا کم گو بلکہ خاموش طبع۔ ابتدا میں ہم اس کی شخصیت سے کچھ متاثر بھی ہوئے کیونکہ وہ سنجیدہ اور متین لگتا تھا مگر یہ

سازفاش ہوگیا کہ اس کی خاموشیٔ طبع کے پیچھے یہ کمزوری ہے کہ وہ انگریزی نہیں بول سکتا تھا، اور ویسے بھی سلیقے سے بات کرنے سے عاری تھا، اس لئے وہ خاموشی میں ہی بھلائی سمجھتا تھا۔ ہم پر یہ بھی عیاں ہوگیا کہ متعصب سکھ ہے۔ یہ تعصب اس کے احکامات سے ظاہر ہوتا تھا۔

کیمپ کا کوارٹر ماسٹر کیپٹن موزے عیسائی تھا۔ اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ متعصب ہے بلکہ وہ اکثر خطرات مول لے کر ہماری ضروریات پوری کر دیا کرتا تھا۔

میڈیکل افسر دھرم پال تھا تو ڈاکٹر لیکن وہ پہلے ہندو تھا اس کے بعد کچھ گنجائش رہ جائے تو وہ ڈاکٹر تھا۔ ایسی گنجائش اس نے کبھی بھی پیدا نہیں کی۔ وہ ڈاکٹری جیسے معزز پیشے کے لئے بدنما داغ تھا۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ بیمار قیدیوں کو نہ توجہ دی جائے نہ دوائی۔ ہمارے اپنے ڈاکٹروں کی بدولت مریضوں کو کچھ سہارا بھی مل جاتا تھا۔

گروپ کمانڈنٹ کرنل موحبدار کے متعلق تو پہلے بھی بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ یہاں اتنا سا اور بتا دوں کہ وہ ہمارے پاس آتا رہتا تھا۔ ہم اسے جب بھی کوئی اپنا مسئلہ یا اپنی ضرورت بتاتے تو وہ یہی ایک جواب دیتا IT IS NO PROBLEM یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" مگر اس نے ہمارا کوئی بھی مسئلہ کبھی حل نہیں کیا تھا۔ اس کی بجائے وہ بڑے اچھے انداز سے ہمیں اس قسم کی باتیں سنایا کرتا تھا کہ ہندوستان میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسی وغیرہ اس حد تک ایک دوسرے کے بھائی ہیں کہ آپس میں رشتے ناطے بھی کرتے ہیں۔ یعنی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو اپنی لڑکیوں کے رشتے دے دیتے ہیں۔

اس بے بنیاد پروپیگنڈے کے علاوہ وہ اس قسم کی باتیں کرتا تھا کہ ہندوستان کے وسائل لامحدود ہیں اور صنعتی ترقی تو ہندوستان نے اتنی زیادہ کی ہے کہ پاکستان جیسے چھوٹے سے ملک کے لئے ہندوستان کا مقابلہ کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس قسم کی باتوں سے وہ ہمارے ذہنوں کو اپنے ملک کی برتری اور رعب مسلط کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر پاکستانی افسروں کا ردعمل صرف اتنا سا ہوتا تھا کہ بعض مسکرا دیتے باقی خاموش رہتے

فرار کا فیصلہ اور عمل

اللہ کا نام لے کر جنوری ۱۹۷۲ میں سرنگ کی کھدائی شروع کر دی گئی۔ کھدائی کے لیے باورچی خانے کی صرف ایک چھری استعمال کی گئی۔

جنوری ۱۹۷۲ء میں فتح گڑھ قیدی کیمپ میں آتے ہی ہم خیال پاکستانی افسروں نے فرار کی سکیم بنانی شروع کر دی تھی۔ یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میجر طارق پرویز سے میری اچانک اور غیر متوقع ملاقات قید میں ہوئی تھی وہ ملٹری اکیڈمی میں میرا پلاٹون کمانڈر رہ چکا چکا تھا۔ اُس نے قید میں مجھ سے پوچھا تھا کہ میرا فرار ہونے کا ارادہ ہے یا نہیں۔ میں نے اُسے پُرعزم انداز سے بتایا کہ میں فرار کا ارادہ رکھتا ہوں۔ موقع نہ ملا تو موقعہ پیدا کروں گا۔ اب ہم وہ افسر جو فرار ہونا چاہتے تھے سکیمیں بنانے لگے۔

ہم روز اکٹھے بیٹھتے اور فرار کی ترکیبیں زیر بحث لائی جاتیں۔ ہر ترکیب کے خطرات پر بات چیت ہوتی۔ کامیابی اور ناکامی کے امکانات پر غور ہوتا اور یوں ہماری سکیم نکھر کر سامنے آتی رہی۔ تین چار دنوں میں ہم سب اس پر متفق ہو گئے کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات میں تار پھلانگنا یا کاٹنا ممکن نہیں اور یہ کوشش خودکشی کی کوشش ہوگی۔ صرف ایک ذریعہ تھا۔ سُرنگ — یہ ذریعہ اتنا سہل نہ تھا، جتنا آسانی سے سوچ لیا گیا تھا۔ اس کے لئے غیر معمولی حوصلے، ہمت و استقلال، صبر و تحمل اور مہینوں کے حساب سے وقت کی ضرورت تھی۔

ہم سب نے فیصلہ کر لیا کہ سُرنگ کھودی جائے گی۔ فیصلے کے فوراً بعد جگہ اور سُرنگ کی سمت کے انتخاب کے لئے جدوجہد شروع کر دی گئی آپ ذرا ہماری بارکوں کی ساخت اور حصّوں میں تقسیم کی تفصیل ایک بار پھر دیکھ لیں۔ ایک بارک کے ایک حصّے میں پانچ غسل خانے بنائے گئے تھے۔ ہم نے ان میں سے ایک غسلخانہ منتخب کر لیا۔ یہ خاردار تار کی پہلی یعنی اندرونی باڑ سے تقریباً تیس گز دور تھا۔

سرنگ کے لئے یہی موزوں سمجھا گیا۔

سب سے پہلا مسئلہ یہ پیش آیا کہ فرش سیمنٹ کا تھا، اسے آواز پیدا کئے بغیر توڑا کس طرح جائے۔ کھدائی کی دھماکہ نما آواز بھی سنتریوں کو اندر بلا سکتی تھی۔ یسم اللہ پر ہی پکڑے جانے کا خطرہ سو فیصد تھا۔ اللہ کی مدد شاملِ حال تھی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ فتح گڑھ چھاؤنی راجپوت رجمنٹ کا ٹریننگ سنٹر تھا۔ رنگروٹ چاند ماری اور رائفل فائرنگ کی مشق، کیا کرتے تھے۔ چاند ماری کا رینج کیمپ سے بمشکل ایک سو گز دور تھا۔ ہمارے جن سویلین دوستوں نے رائفل کے فائر کا دھماکہ سنا ہے انہیں اندازہ ہو گا کہ ایک سو گز دور رائفل فائر کی جائے تو دھماکہ کتنا زیادہ ہوتا ہے، اور جب یہ دھماکے مسلسل ہوں تو اردگرد کانوں پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔

ہمارے ایک ساتھی افسر نے کہا کہ فرش کی کھدائی اس روز کی جائے جس روز چاند ماری ہو رہی ہو، اور کھدائی کے دھماکے فائر کے دھماکوں میں گم کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ نہایت اچھی تجویز تھی۔ اس پر تمام ساتھی متفق ہو گئے۔ اس تجویز کا ہم پر یہ اثر بھی ہوا کہ یہ سوچ کر ہمارے حوصلے بڑھ گئے کہ جس طرح اس مسئلے کا حل نکل آیا ہے اسی طرح خدا ہماری ہر مشکل آسان کر دے گا۔

رائفلوں کے دھماکوں میں
ہم نے فرش توڑا

ہم نے دیکھ لیا تھا کہ جہاں سرنگ کو پہنچانا ہے وہ علاقہ صاف اور کھلا ہے اور وہی موزوں ہے۔ ہم نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں دو سو گز لمبی سرنگ کھودنی پڑے گی اور اس کے لئے جو عرصہ درکار ہو گا وہ تین اور چار ماہ کے درمیان ہو گا۔ کھدائی کیلئے ہمارے پاس کوئی موزوں اوزار نہیں تھا۔ میس کے باورچی خانے میں سبزی کاٹنے والی

ایک چھری تھی۔ ذرا تصور فرمایئے کہ ہمیں ایک چھری سے دو سو گز لمبی سرنگ کھودنی تھی۔ بعد میں ہمارے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ کہاں ہم نے تین چار ماہ کا اندازہ لگایا تھا مگر عملاً ہم نو مہینوں میں صرف ستر گز سرنگ کھود سکے تھے۔

جنوری ۱۹۷۲ء کے تیسرے ہفتے میں اللہ کا نام لے کر سرنگ کی کھدائی شروع کر دی گئی۔ اس روز راجپوت سنٹر کے رنگروٹ چاند ماری کر رہے تھے۔ ان کی رائفلوں کے دھماکوں سے آواز ملا کر ہم نے چار مربع فٹ فرش توڑ لیا۔ فرش ایک موٹے کیل پر پتھر مار مار کر توڑا گیا تھا۔ فرش کے ٹکڑے محفوظ رکھ لئے گئے۔ اس کے بعد سرنگ کی کھدائی چھری سے شروع کی گئی اور تقریباً آٹھ فٹ تک پہنچا دی گئی۔

اب دوسرا اور سب سے بڑا مسئلہ سامنے آیا۔ یہ تھا۔ مٹی غائب کرنے کا مسئلہ۔ ہمیں یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ مٹی کتنی زیادہ نکلے گی۔ ہمارے ساتھیوں نے پتلونوں کی جیبوں میں نیچے چھوٹے چھوٹے سوراخ کر لئے اور جیبوں میں مٹی بھر کر باہر لے جانے اور بکھیرنے لگے مگر اس طریقے سے مٹی پھینکنے کی رفتار اس قدر کم تھی کہ ایک دن کی نکالی ہوئی مٹی غائب کرنے کے لئے دو تین دن درکار تھے۔ یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ ہم ہر لمحہ سنتریوں اور ہندوستانی افسروں کی نظر میں رہتے تھے۔ کسی بھی وقت کوئی اچانک اندر آ سکتا تھا۔ ہم تمام ساتھی گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ مٹی کو فوراً غائب کرنے کا کوئی تیز اور بہترین طریقہ دریافت کرنا تھا۔

اسکے ساتھ ہی ایک اور مسئلہ سامنے آ گیا۔ روزمرہ کھدائی کے بعد سرنگ کے دہانے کو کھلا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اسے ایسے طریقے سے چھپانا تھا کہ کوئی ہندوستانی افسر اچانک غسلخانے میں چلا جائے تو اسے شک بھی نہ ہو کہ یہاں سے سرنگ کھودی جا رہی ہے۔ اس مسئلے کا حل جلدی ہی سوچ لیا گیا۔ سرنگ کونے میں کھودی گئی تھی، لہٰذا اس کے دہانے پر دو طرف دیواریں تھیں۔ منہ کے قریب سے ہم نے دیواروں کی سب سے نیچے والی اینٹوں کو نکال کر اس طرح پھر وہیں جما دیا کہ ان کا کچھ حصہ باہر کو نکلا رہا۔

ان اینٹوں پر لکڑی کا ایک تختہ رکھ دیا گیا اور تختے پر کچھ کپڑے رکھ دیئے گئے تاکہ اوپر کی مٹی سرنگ میں نہ جائے۔ یہ تختہ ان چھوٹی میزوں میں سے ایک کا تھا، جو ہندوستانیوں نے پلنگوں کے ساتھ رکھنے کے لئے دی تھیں۔ ہر میز کے دو تختے تھے۔ ایک اوپر ایک

نیچے۔ ہم نے ایک میز کا نیچے والا تختہ اتار کر استعمال کیا تھا تختے پر رکھے ہوئے کپڑوں پر ہم نے ضرورت کے مطابق مٹی ڈالی اور فرش کے ان ٹکڑوں کو اس پر جما دیا جو ہم نے یہاں سے اکھاڑے تھے۔ یہ انتظام ایسی خوبی سے کیا گیا کہ کوئی غور سے دیکھتا تو ہی اسے شک ہوتا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔

اس غسلخانے کے بالکل سامنے ایک بلب لگا ہوا تھا۔ اسے توڑ دیا گیا۔ اس غسلخانے کے نلکے کو بالکل بیکار کر دیا تاکہ یہ نلکہ استعمال ہی نہ ہو اور سرنگ میں پانی جانے کا خطرہ نہ رہے۔ سرنگ کے متعلق صرف اُن پاکستانی افسروں کو علم تھا جو اس سکیم میں شامل تھے۔ باقی سب سے اسے چھپایا گیا تھا۔ اس رازداری کی بہت ہی ضرورت تھی۔ چونکہ سردیوں کا موسم تھا اس لیے غسلخانے کم ہی استعمال ہوتے تھے کسی نے یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ پانچویں غسلخانے کا نلکہ خراب ہے یا کیوں خراب ہے۔ موسم گرم ہوتے ہی جب ہمارے دیگر ساتھیوں نے پانچویں غسلخانے کی طرف توجہ دی تو ہم نے ان پر یہ راز فاش کر دیا۔ وہ آخر ہمارے ساتھی تھے، پاکستانی تھے، وہ بھی ہمارے مشن اور مہم میں شامل ہو گئے۔

مٹی غائب کرنے کا طریقہ بھی ایک افسر نے سوچ لیا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ اس مقصد کے لئے خندق والے بیت الخلا استعمال کئے جائیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ خندق والے بیت الخلا کیسے ہوتے ہیں۔ ان کی خندق بہت گہری ہوتی ہے۔ اس کے اوپر لکڑی کے کموڈ بنائے جاتے ہیں۔ . . . . . یہ بیت الخلا ہمارے بہت کام آئے۔ مٹی ٹھکانے کے لئے چادریں پھاڑ کر چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھرتے اور کمبل میں چھپا کر بیت الخلا میں خالی کر آتے۔ کمبل ٹھنڈ کے بہانے اوپر لئے جاتے تھے۔ لیکن یہ مٹی کی تھیلی چھپا کر بیت الخلا تک لے جانے کا بہانہ تھا۔

ہم نے جب دیکھا کہ مٹی ٹھکانے لگانے کی رفتار تیز ہو گئی ہے اور کھدائی کا کام بھی رواں ہو گیا ہے تو ہم نے فوجی اندازِ عمل کے مطابق کام کرنے والے افسروں کے باقاعدہ گروپ بنا دیئے۔ یہ اس طرح تھے۔

کھودنے والا گروپ :- اس گروپ میں صرف انہیں رکھا گیا جن کے جسم دبلے پتلے تھے۔ کیونکہ سرنگ کا قطر دو فٹ تھا۔

مٹی غائب کرنے والا گروپ :- اس کا کام نام سے ظاہر ہے۔

سیکورٹی گروپ :- جب سرنگ کی کھدائی ہو رہی ہوتی تو اس گروپ کے افسر باہر گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ خطرے کی صورت میں کھانس کر اندر والوں کو خبردار کر دیں اور خطرے کو دور رکھنے کی کوشش کریں۔ روزمرّہ کھدائی کا کام ختم ہونے کے بعد یہ اس گروپ کی ذمہ داری تھی کہ سُرنگ کا دہانہ تختے، کپڑوں اور فرش کے ٹکڑوں سے چھپا دے۔

سُرنگ کی کھدائی کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ کھدائی کرنے والے افسر غسلخانے میں کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے دو قمیصیں اور دو پتلونیں غسل خانے میں رکھ دی گئی تھیں۔ یہ کھدائی کے لئے پہنی جاتی تھیں۔ خاکی کپڑے سے ایک ٹوپی بنائی گئی تھی جو تمام تر سَر کو اور کانوں کو بھی ڈھانپ لیتی تھی۔ اس سے سر اور کان مٹی سے صاف رہتے تھے، ورنہ انسان اندر سے بھوت بن کر نکلتا۔ یہ تو بتا چکا ہوں کہ کھدائی کا واحد اوزار سبزی کاٹنے والی چھری تھی۔

اسیری کی پہلی عید
ہندو کی ازلی کمینگی

ابھی چند دن ہی گزرے تھے۔ سرنگ کچھ آگے چلی گئی تھی۔ ایک شام ہم حسبِ معمول گنتی کے لئے باہر کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے بتا آیا ہوں کہ گنتی (رول کال) دن میں دو دفعہ، صبح اور شام، ہوا کرتی تھی۔ ایک ہندوستانی افسر آکر ہمیں گن لیتا اور کبھی ہر ایک افسر کا نام پکار کر اُسے الگ کر لیتا۔ اُس شام ایک سکھ کیپٹن گنتی کے لئے آیا۔ اُس کے ساتھ ایک حوالدار تھا۔ یہ سکھ کیپٹن پہلی بار کیمپ میں دیکھا گیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو گیا وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے کسی کے انتظار میں ہو۔

ہم پریشان ہو گئے۔ یہی خدشہ تھا کہ ہماری سرنگ کا سراغ مل گیا ہے اور یہ سکھ اپنے سنیئر افسروں کے انتظار میں ہے۔ چند ایک صبر آزما لمحوں کے بعد اس نے ہمارے سنیئر افسر کرنل حفیظ سے کہا کہ وہ افسروں کے متعلق اسے رپورٹ دیں۔ یہ فوجی طریقہ ہے کہ جونیئر افسر اپنی پارٹی کو "اٹینشن" کر کے اس کے متعلق سنیئر افسر کو رپورٹ دیا کرتا ہے۔ کرنل حفیظ نے اس سکھ کیپٹن سے کہا کہ اس سے پہلے یہاں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ وہ کرنل ہیں وہ ایک کیپٹن کو رپورٹ نہیں دیں گے۔

سکھ کیپٹن نے کہا۔ "میں آپ کو حکم دیتا ہوں کہ مجھے رپورٹ دیں"۔

"میں تمہارا حکم ماننے سے انکار کرتا ہوں"۔ کرنل حفیظ نے جواب دیا۔

سکھ نے غصے کا اظہار کیا اور کچھ احکام دیئے جنہیں ہم فوجی زبان میں "ورڈز آف کمانڈ" کہتے ہیں۔ مثلاً "اٹینشن" "لیفٹ ٹرن" "رائٹ ٹرن" وغیرہ۔ ہم میں سے کسی نے اس پر عمل نہ کیا۔ سکھ نے اپنے حوالدار سے کہا کہ وہ یہی ورڈز آف کمانڈز دے۔ وہ بھی دو چار بار چلایا

مگر ہمارا ردِ عمل وہی تھا کہ خاموشی سے کھڑے ہیں۔ سکھ کیپٹن نے اپنی خفت کو غصے میں چھپانے کی کوشش کی اور چلا گیا، اور ہم اس کی سکھا شاہی پر ہنس پڑے۔

وطن سے دور، دیارِ غیر میں اور عیار دشمن کی اسیری میں پہلی عید آئی۔ یہ عید الضحیٰ تھی۔ پہلی عید کی خوشی کیا ہوتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بے مثال قربانی یاد آئی۔ ہمارے سینوں اور ملی جذبے میں نئی قوت نئی تازگی پیدا ہو گئی۔ ہم نے مشرقی پاکستان کی سرزمین کو کفار کی یلغار سے بچانے کے لئے بے دریغ قربانی دی تھی۔ شہیدوں کے خون کی لالی اس سرزمین کے ذرّے ذرّے میں رچ بس گئی ہے۔ اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ ہمارے ہاں کے نام نہاد دانشور، ادیب اور صحافی جنگِ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ناکامی کا سہارا لے کر لہو کے تقدس کو ختم کرنے کے لئے بے بنیاد باتیں لکھ رہے ہیں۔ قوم کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی مذموم کوشش کی جا رہی ہے۔

ہم سب پُر امید تھے کہ ہزار پردے ڈالے جائیں قوم پر یہ راز فاش ہو کر رہے گا کہ اس شکست کا ذمہ دار کون تھا اور شہیدوں کا لہو کیوں رنگ نہ لایا۔ میں اور میرے ساتھی قید میں بھی اور قید سے آزاد ہو کر بھی یہی سوچتے رہتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قوم کو مفاد پرست عناصر تاریکی میں رکھنے میں کامیاب ہو جائیں اور قوم اپنے غازیوں اور شہیدوں کو اس عارضی شکست کا ذمہ دار ٹھہرا کر انہیں توہین آمیز طریقے سے فراموش کر دے۔

میں خدا کا شکر بجا لایا کرتا تھا کہ مدیر "حکایت" جناب عنایت اللہ نے غازیوں اور شہیدوں کی قربانیوں اور روایات کو زندہ رکھنے اور انہیں آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا کٹھن اور صبر آزما کام اپنے ذمے لیا ہے اور وہ افواجِ پاکستان کی صحیح کارکردگی کی واضح تصویر پیش کر رہے ہیں۔

اسیری میں پہلی عید ہم سب کے لئے جذبات کا طوفان لے کے آئی۔ یہ مسرتوں اور خوشیوں کی عید نہیں تھی۔ کوئی ہماہمی نہیں تھی۔ کوئی کسی سے گلے ملنے کو بے تاب نہ تھا۔ ہر کوئی بوجھل بوجھل قدموں سے اِدھر اُدھر پھرتا نظر آتا تھا۔ ہر کسی کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ جذبات کے سیلاب کو سینے میں ہی روکے رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔

ہمیں عید کی نماز اپنی بارک میں ہی پڑھنی تھی۔ ہمیں اپنے جوانوں سے ملنے اور اُن کے ساتھ عید پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ہندو نے اپنی فطری کمینگی کا پوری طرح مظاہرہ کیا تھا۔ ہندو افسروں کو شاید ڈر بھی تھا کہ سارے کیمپ کے قیدی اکٹھے ہو گئے تو بھاگ جائیں گے۔ ہندو نہتے پاکستانیوں سے بھی خائف تھے۔ ان کی یہی نفسیاتی کیفیت تھی، جس کے زیر اثر وُہ پاکستانیوں کو ہر طرح پریشان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس لحاظ سے بھی ہماری عید بے مزہ رہی کہ اس مقدس دن بھی ہم اپنے جوانوں سے مل نہ سکے۔ ہم افسروں نے اپنی بارک کے ایک حصّے میں جسے تفریح گاہ بنا لیا گیا تھا نمازِ عید پڑھی۔ امامت میجر یحییٰ حمید نے کی۔ انہوں نے مختصر سا خطبہ دیا اور نماز کے بعد دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔ انہوں نے پاکستان اور عالم اسلام کی سلامتی کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور جب انہوں نے کہا "اے خدائے ذوالجلال، ہمارے ان ساتھیوں کے طفیل جنہیں تیری ذاتِ باری نے شہادت کے عظیم رتبے سے سرفراز فرمایا ہے، ہماری خطائیں معاف کر دے" تو ہم سب نے اپنے جذبات کے آگے جو بند باندھے تھے وہ ٹوٹ گئے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ہم نے اللہ کے حضور اشکوں کے نذرانے پیش کئے۔

نماز سے فارغ ہوئے تو گروپ کمانڈنٹ کرنل موجمدار کالی شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس آ گیا۔ اس نے ہمیں عید مبارک کہی۔ پھر دوسرے ہندوستانی افسر بھی آ گئے۔ ہمارے خاص کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانا اچھا تھا۔ چاول پکائے گئے تھے۔ شامی کباب بھی تھے، مرغی بھی تھی، مگر کھانا آدھے سے زیادہ بچ گیا۔ جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کھانا زیادہ پکا تھا بلکہ یہ کہ کوئی بھی کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ بھوک کا نام و نشان نہ تھا۔ سب نے زبردستی لقمے حلق میں ٹھونسے، اور اسیری کی عید گذر گئی۔

کچھ دنوں بعد ہمارے تین ساتھی ہم سے جُدا ہو گئے۔ پہلے میجر قیوم اور کیپٹن کرم خاں کو کسی دوسرے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں کہاں بھیجا گیا ہے۔ بہت کھوج لگایا لیکن پھر بھی معلوم نہ ہو سکا۔ بعد میں پتہ چلا کہ بہت سے افسروں کو جنگی جرائم کے مجرم قرار دے کر انہیں کسی کیمپ میں جمع کر لیا گیا تھا، اور ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی

کرنے کی بجائے انہیں ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئی تھیں۔ یہ اذیتیں اس قدر غیر انسانی تھیں کہ یہ افسر ایک عرصے تک صحت یاب نہ ہو سکے۔

ہم سے جدا ہونے والے تیسرے افسر میجر اکرم تھے۔ آپ پڑھ چکے ہوں گے کہ وہ مشرقی پاکستان میں زخمی ہو گئے تھے اور اسی حالت میں جنگی قیدی میں آئے تھے۔ کیمپ میں انہیں ہر روز ایم۔ آئی۔ روم (ڈسپنسری) لے جایا جاتا تھا لیکن کام کی کوئی دوائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے زخم ٹھیک نہیں ہو رہے تھے۔ ہندوستانیوں کو جانے کیسے رحم آ گیا۔ میجر اکرم کو سی۔ ایم۔ ایچ آگرہ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کا کیس دراصل ہسپتال کا ہی کیس تھا۔ انہیں زخمی ہونے کے تیسرے ماہ ہسپتال بھیجا جا رہا تھا، مگر ہندوستانیوں کے رحم میں بھی بے رحمی تھی۔ انہیں بذریعہ ہیلی کاپٹر یا ریل گاڑی بھیجنے کی بجائے فوجی ٹرک میں بھیجا گیا جس میں سیٹ نہیں ہوتی۔ ذرا تصور فرمایئے کہ ایسی شدید زخمی حالت میں انہیں ڈیڑھ سو میل طویل سفر پر ٹرک میں بھیجا گیا۔ ہم سب نے احتجاج کیا مگر بے سود۔ ہندو میجر اکرم کو اذیت میں ڈال کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میجر اکرم روانہ ہوئے تو ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سُرنگ میں خون اور اچانک تلاشی

سُرنگ کی کھدائی جاری تھی۔ کام تسلی بخش رفتار سے خیریت سے ہو رہا تھا۔ اسی دوران جنرل کول ہمارے کیمپ کے دورے پر آیا تو ہماری بارک میں آیا۔ خاصا بدتمیز قسم کا جرنیل تھا۔ ہم سے ہماری تکالیف کے متعلق پوچھنے کی بجائے اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں یہاں بڑے ہی آرام اور آسائش میں رکھا گیا ہے اور ہمیں یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ اس کے برعکس، اس نے کہا کہ پاکستان میں ہندوستانی قیدیوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ ایک جرنیل کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے، مگر بھارت کے جرنیلوں کا کردار یہی کچھ ہے۔

پھر کیمپ میں تفتیش اور پوچھ گچھ INTERROGATION کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کا مقصد معلومات حاصل کرنا نہیں بلکہ پاکستان میں استعمال کرنے کیلئے

ایجنٹ اور جاسوس تیار کرنا تھا۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ ہر روز دو تین افسروں کو بلایا جاتا۔ اکیلے اکیلے سے رسمی پوچھ گچھ کی جاتی اور بھانپا جاتا کہ ہم میں سے کون کون ان کے جال میں پھنس سکتا ہے۔ انیٹروگیشن کرنے والوں نے صاف الفاظ میں لالچ اور دھمکی دے کر کہنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کے ایجنٹ بن جاؤ۔ لالچ یہ دیا جاتا کہ ہم تمہیں فوری طور پر پاکستان بھیج دیں گے، تم وہاں جا کر ہندوستان کے لئے کام کرو۔

دھمکی یہ دی جاتی تھی کہ تم ہماری پیش کش قبول نہیں کرو گے تو تمہیں جنگی جرائم کا مجرم قرار دے دیا جائے گا۔ اس لالچ اور دھمکی کے علاوہ ہندوستانیوں نے ہم میں صوبائی تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ اللہ کی کرم نوازی ہے کہ تمام افسر ثابت قدم رہے۔ نہ کسی نے لالچ قبول کیا نہ کوئی دھمکی سے خائف ہوا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ جوانوں کے کیمپ میں بھی ہندوستانی افسر یہی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کیا اثر ہوا ہو گا۔ البتہ یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے جوانوں کا قومی جذبہ خاصا مستحکم تھا۔

ہمیں معلوم ہوا کہ بعض کیمپوں میں ہندوستانیوں نے تفتیش کے لئے حسین لڑکیاں استعمال کی تھیں۔ جنسی جبلت انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ ہندوستانی اسی انسانی کمزوری سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہندوستانیوں نے کیمپوں کے علاوہ بھی لڑکیوں کو استعمال کیا تھا۔

"انیٹروگیشن" کے دوران بھی ہم سرنگ کی کھدائی میں مصروف رہے اور آگے بڑھتے گئے، مگر ایک ایسی دشواری کا سامنا ہو گیا جس نے ہمارا خون نکال دیا۔ یہ علاقہ جہاں ہمارا کیمپ تھا کسی زمانے میں گنگا کی گزرگاہ رہا ہو گا۔ دریا وہاں چھوٹی چھوٹی کنکریاں چھوڑ گیا۔ یہ کنکریاں ہماری سرنگ کے راستے میں آ گئیں۔ ہم سرنگ میں پیٹ اور کہنیوں کے بل رینگ کر جاتے اور نکلتے تھے۔ لیٹ کر ہی کھدائی کرتے تھے۔ جگہ ہی اتنی تھی۔ کنکریوں نے ہماری کہنیوں اور گھٹنوں کو چھیلنا شروع کر دیا اور خون رسنے لگا۔ یہ زخم ٹھیک ہونے کی بجائے ہر روز کھل جاتے اور ان میں سے خون رستا رہتا۔ ہم ان پر کپڑے لپیٹ کر آستینیں نیچے رکھتے

تاکہ ہندوستانی افسروں کو نظر نہ آ سکیں۔

یہ زخم درد کرتے تھے۔ ہم رازداری کی خاطر ان کی باقاعدہ مرہم پٹی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جذبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ ہم نے درد کی یہ مسلسل ٹیسیں برداشت کیں۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہم نے خون دے کر آزادی حاصل کی اور پاکستان بنایا تھا۔ خون کے نذرانے دیئے بغیر آزادی مل ہی نہیں سکتی۔ مجھے اللہ کی درگاہ میں بھروسہ تھا کہ سرنگ ہمارا جو خون پی رہی ہے، وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہم کسی گھر میں نقب نہیں لگا رہے تھے۔ ہم کفار کی قید سے آزاد ہو کر اسے یہ بتانا چاہتے تھے کہ اللہ کے سپاہی کو محبوس اور مجبور رکھنا آسان نہیں۔

پھر ایک روز قیامت آ ہی گئی۔ ہندوستانی افسر اپنے عملے کے ساتھ اچانک آ دھمکے اور بارک کی تلاشی شروع کر دی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہم نے کہیں کوئی انگوٹھی، گھڑی، ہندوستانی کرنسی یا کوئی اور قیمتی چیز تو کہیں چھپا کے نہ رکھی ہو۔ انہیں فرش اور باہر زمین پر کہیں بھی ذرا سا شک ہوتا وہاں کھودتے۔ انہوں نے غسلخانے بھی دیکھے ہمارے دل اچھل کر حلق میں آ گئے تھے۔ ہم سزا سے نہیں ڈرتے تھے، ڈر ناکامی کا تھا۔"

انہوں نے تقریباً چار گھنٹے تلاشی میں صرف کئے۔ یہ چار گھنٹے چار مہینوں کے برابر تھے۔ وہ ایک خاص طریقے سے یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کہیں سرنگ تو نہیں کھودی جا رہی؟ یہ ایک معجزہ تھا اور اللہ کا بہت بڑا احسان کہ تلاشی لینے والے ہار گئے۔ ان کے چہرے لٹک آئے اور وہ مایوس ہو کر چلے گئے۔ سرنگ کا منہ ایسی خوبی سے ڈھکا ہوا تھا کہ ان بدبختوں کو وہاں شک تک نہ ہوا۔

ہمارے شناختی کارڈ تیار کئے گئے۔ ان پر ہمارے فوٹو چسپاں کئے گئے، ان پر ہمارے عہدے، نام، جنگی قیدی نمبر اور کیمپ نمبر لکھے گئے۔ ہمارے فوٹو لئے گئے تو ہم فکرمند ہوئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے ہر افسر کا فوٹو محفوظ کر لیا ہے۔ فرار کی صورت میں یہ فوٹو اخباروں وغیرہ میں چھپوا کر گرفتاری آسان بنائی جا سکتی تھی۔ ہم نے اس خطرے سے بچنے کے لئے یہ اہتمام کیا کہ جن کی مونچھیں نہیں تھیں یا چھوٹی تھیں، انہوں نے بڑھانی شروع کر دیں اور بعض نے داڑھیاں بڑھا لیں۔ اس طرح ہم نے حلئے اپنی تصویروں سے مختلف کر لئے۔

کیمپ میں جن بھی آگئے۔ یہ جن ہمارے ایک ساتھی میجر میر عالم کے اردلی کے اندر وارد ہوئے تھے۔ ایک روز یہ خبر پھیل گئی کہ بہت جلدی رہائی ملنے والی ہے۔ معلوم ہوا کہ میجر میر عالم کے اردلی میں جن آتے ہیں اور خوشخبری جنوں نے سنائی ہے کہ قیدیوں کو ایک ماہ کے اندر رہا کر دیا جائے گا۔ یہ خبر افسروں کی بارک میں آئی تو ہم سے بعض ہنس دیئے، لیکن کچھ افسروں نے سچ مان لیا۔ بے بسی کے عالم میں انسان توہم پرست بھی ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو حسین فریب دینے لگتا ہے۔ ایک ماہ کے اندر آزادی کی خوشخبری نے سب کو مایوس کر دیا کیونکہ پتہ چلا کہ یہ اردلی نفسیاتی مریض ہے۔ اسے کوئی دورہ پڑتا ہے جس میں ہذیانی اور اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتا ہے۔ چونکہ اس کے ذہنِ لاشعور میں قید اور رہائی بھی تھی۔ اس نے یہ خوشخبری سنا دی کہ ایک ماہ کے اندر رہائی ملنے والی ہے۔

پہلے ہم بارک کے برآمدے میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ پھر بارک سے باہر ایک جگہ کو ہم نے باقاعدہ مسجد بنا لیا اور باقاعدہ اذان ہونے لگی۔ نماز کے وقت تمام تر کیمپ سے اذان کی مقدس صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ فجر اور عشا کی نماز کے بعد ذکرِ الٰہی اور درود سلام کی گونج دور دور تک سنائی دیتی اور کفرستان کی فضا کو مرتعش کرتی تھی۔

۱۹۷۲ء کے مارچ کا مہینہ گذر رہا تھا تو میں ان ساتھیوں کے چہروں پر مایوسی کے نمایاں آثار دیکھنے لگا جو جلد رہائی کی خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ابتدا میں حقائق کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ غالباً اپنے دشمن کی ذہنیت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے تھے۔ ہندو نے مسلمانوں پر پہلی فتح حاصل کی تھی اور ہندو کو اچھی طرح احساس تھا کہ اس کی یہ فتح محض نلوک ہے۔ وہ اب بے بس جنگی قیدیوں سے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کا انتقام لے رہا تھا۔ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ ہمیں اتنی جلدی رہا کر دے گا مگر ہمارے کچھ دوست خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حالات کچھ اور بتا رہے تھے۔ اس سے ان دوستوں کو مایوسی ہوئی، پھر انہوں نے حقائق کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ بے چینی، بیقراری اور یاسیت کا یہی علاج تھا کہ حقائق سے منہ موڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔

مارچ کے آخری ہفتے میں پاکستان سے خطوط آنے لگے۔ خط تو آپ بھی لکھتے ہیں اور آپ

کو خط ملتے بھی ہیں، لیکن آپ خط کی اس اہمیت اور قدر و قیمت کو نہیں جانتے ہوں گے جو ہم نے اسیری میں دیکھی ہے۔ خط کو آدھی ملاقات کہنا محاورہ ہے مگر قیدی کیمپ میں اپنے وطن سے آیا ہوا اپنے کسی عزیز کا خط ہمیں بتاتا تھا کہ "آدھی ملاقات" محاورہ نہیں حقیقت ہے۔ جذبات سے لبریز حقیقت!

خط کی طرح پاکستان کی بھی اہمیت اور قدر و قیمت ہمیں دیارِ غیر کی قید میں معلوم ہوئی۔ بارک میں لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا جس سے ہمیں آل انڈیا ریڈیو اور بی بی سی کی خبریں سنائی جاتی تھیں۔ ہم ان خبروں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے، لیکن ان میں جب پاکستان کا نام آتا تھا تو جذبات کی شدت اور عقیدت کی انتہا سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کسی چیز پر پاکستان کا نام لکھا نظر آتا تو اسے احترام سے اٹھا لیتے تھے۔ یہ عقیدت مندی ہمیں فرار کی کوششوں میں نیا حوصلہ اور نیا عزم دیتی تھی۔

سُرنگ میں دم گھٹنے لگا

سرنگ آگے بڑھتی جا رہی تھی اور مسائل بڑھتے جا رہے تھے۔ پکڑے جانے کا خطرہ تو ہر لمحہ سر پہ ننگی تلوار کی طرح لٹکتا رہتا تھا۔ ہندوستانی افسر اور ان کا عملہ بو گیر کتوں کی طرح سونگھتے پھرتے تھے۔ لیکن ہم نے اس خطرے اور نتائج کو قبول کر رکھا تھا۔ دشواریاں کچھ اور تھیں جو بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان میں ایک اضافہ یہ ہوا کہ سُرنگ چونکہ لمبی ہو گئی تھی اس لئے مٹی کو اس کے دہانے تک لانا مشکل ہو گیا۔ یہ پیشِ نظر رکھیں کہ سرنگ کی چوڑائی صرف دو فٹ تھی۔ مٹی باہر لانے کے لئے ہم اُلٹے رخ رینگتے تھے اور کچھ مٹی اپنے ساتھ سمیٹ لاتے تھے۔ کہنیاں اور گھٹنے تو چھل ہی رہے تھے، اب اتنی دور سے مٹی باہر لانا محال ہو رہا تھا۔

دشواریوں میں دوسرا اضافہ آکسیجن کی کمی نے کیا۔ جوں جوں ہم سُرنگ کے دہانے سے دور اندر ہوتے جا رہے تھے دم گھٹنے لگا اور کام کرنے کی ہمت کم ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اندر کے حبس کی زیادتی اور آکسیجن کی کمی کے اثرات تھے۔ ان کے باوجود کھدائی جاری رکھی، لیکن یہ سوچ

پریشان بھی کرنے لگی کہ اس مسئلے کا حل کیا ہو۔ آکسیجن کی کمی کے ساتھ ساتھ سُرنگ میں روشنی کا بھی مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس کا کوئی علاج نظر نہیں آتا تھا۔

اگر نیت صاف اور جذبہ نیک ہو تو اللہ کی مدد یقیناً حاصل ہوتی ہے۔ اپریل ۱۹۷۲ء کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک اور جرنیل کیمپ کے دورے کے لئے آیا۔ یہ جنرل کول سے بہت مختلف تھا۔ خاصا سلجھا ہوا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اور ہماری سنتا رہا۔ اس نے حکم دیا کہ میجر اور اس سے اوپر کے عہدوں کے افسروں کو ان کی گھڑیاں اور ٹرانسسٹر دے دیئے جائیں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس سے نیچے کے عہدوں کے افسروں، یعنی لیفٹیننٹ اور کپتانوں کو، یہ چیزیں اس لئے نہیں دی جاسکتیں کہ نوجوان ہونے کی وجہ سے ان میں فرار کا رجحان اور خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ٹرانسسٹر اور گھڑی کے ساتھ فرار کا کیا تعلق ہے۔ کیمپ سے باہر نکل جانے کی صورت میں یہ دونوں چیزیں فروخت کر کے ہندوستانی پیسے حاصل کئے جا سکتے تھے۔

ٹرانسسٹروں کی واپسی کی خبر نے ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔ اس سے پہلے ہم سُرنگ میں روشنی کے لئے دیا استعمال کرتے تھے۔ جس میں ہم راشن کا گھی جلاتے تھے۔ مگر یہ دیا گھٹن میں اضافہ اور آکسیجن میں مزید کمی کرتا تھا۔ ہم نے ایک ٹارچ چھپا رکھی تھی مگر اس میں سیل نہیں تھے ٹرانسسٹر مل جانے کی صورت میں ہم ان کے سیل ٹارچ میں ڈال کر سُرنگ کے اندر استعمال کر سکتے تھے۔ ہمیں جب ٹرانسسٹر مل گئے تو ہم نے جو سوچا تھا وہ عملاً صحیح ثابت ہوا۔ ٹارچ میں سیل ڈالے اور سُرنگ کے اندر روشنی کر لی۔ اس سے کھدائی کا کام تیز ہوگیا، مگر اس تیزی نے وہ رکاوٹ بھی تیزی سے ہمارے راستے میں کھڑی کر دی جو ہمیں مارچ کے مہینے سے پریشان کئے ہوئے تھی یہ تھی آکسیجن کی کمی۔

اب کمی نہیں فقدان پیدا ہو گیا۔ اندر دس منٹ مسلسل کام کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس کا کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا۔ کام کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ ہم نے سوچا تھا کہ سات آٹھ مہینوں میں ہم دو سو گز لمبی سُرنگ کھود لیں گے اس وقت ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ مشکل بھی آپڑے گی۔ اس کے علاوہ مٹی باہر لانا بھی مشکل ہو گیا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ پیچھے آنے کے لئے ہمیں پیچھے کو رینگنا پڑتا تھا کیونکہ سُرنگ اس قدر تنگ تھی کہ پیچھے کو گھوما نہیں جا سکتا تھا۔

مٹی باہر لانے کی مشکل کو ہم نے اس طرح آسان کیا کہ ایک لمبی رسی تیار کی تھیلی کو مٹی سے بھر کر اس کے منہ پر رسی باندھ دیتے تھے۔ سُرنگ کے دہانے پر ہمارا ایک ساتھی رسی کھینچ کر باہر نکال لیتا تھا، مگر اس طریقے میں دو مشکلیں تھیں۔ ایک یہ کہ تھیلی صرف باہر جاتی تھی، اسے اندر بھیجنے کے لئے ایک افسر اندر جاتا تھا۔ دوسری مشکل یہ کہ بعض جگہوں پر سرنگ ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ وہاں تھیلی اٹک جاتی تھی۔ اس سے کام کی رفتار سست ہو رہی تھی۔

بہت غور و خوض کے بعد آکسیجن کے حصول کا طریقہ بھی دریافت کر لیا گیا۔ یہ ایک تجربہ تھا جو کامیاب رہا۔ ہم نے ایک ڈنڈے کے سرے پر چھری باندھی۔ سُرنگ کے اندر جا کر اس میں اوپر کی طرف ایک سوراخ کرنے لگے جس طرح زمین میں بورنگ کی جاتی ہے۔ سوراخ اوپر ہی اوپر جاتا رہا اور اوپر نکل گیا۔ نیچے سے ہمیں اوپر روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی سُرنگ کا حبس اس سوراخ سے باہر نکل گیا۔ اس کی جگہ دہانے کی طرف سے تازہ ہوا اپنے ساتھ آکسیجن کا خزانہ لے آئی۔ ہم نے نیچے سے سوراخ چوڑا رکھا اور اوپر تنگ۔ اوپر یہ خطرہ تھا کہ کوئی ہندوستانی سوراخ دیکھ لے گا، لیکن اوپر گھاس تھی اور سوراخ تنگ۔ ہم نے اس کے معائنے کا یہ انتظام کیا کہ ایک افسر نے اندر سے ڈنڈہ ذرا باہر نکالا اور ہمارے ایک ساتھی نے اوپر سے دیکھا۔ اتفاق سے سوراخ خاردار تاروں کے نیچے تھا۔ جہاں کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

آکسیجن ملنے سے کام کرنے کی توانائی عود کر آئی مگر مٹی نکالنے کے غیر تسلی بخش طریقے نے رفتار نہ بڑھنے دی۔ ہم نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اس رفتار سے دو سو گز لمبی سرنگ دو برسوں میں مکمل ہو گی۔

جوان فرار ہوئے اور پکڑے گئے

اس دوران جوانوں کے کیمپ میں جانکاہ حادثہ ہو گیا۔ ہندوستانی سنتریوں نے ہمارے چند ایک جوانوں کو شہید کر دیا۔ افسروں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ مگر سب خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے جوانوں کو کیوں شہید کیا گیا ہے وہ ہندو کی قید میں بھڑکے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کا حکم نہیں مانتے تھے۔ فرار کی ایسی کوششیں کرتے تھے جن میں عقل کم اور جذبات اور غصہ زیادہ ہوتا تھا۔ ایسی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ موت یا اذیت ہوتا ہے۔

مئی کا مہینہ اپنے ساتھ بے پناہ گرمی لے کے آیا۔ جوں جوں دن گذرتے جا رہے تھے گرمی اور لُو میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ٹین کی چھتوں نے بارک کو تنور بنا دیا۔ ہندوستانیوں نے پنکھے تو لگا دیئے مگر ان سے جیسے آگ نکلتی تھی۔ تولئے اور دوسرے کپڑے بھگو کر اپنے اوپر ڈال کر ہم دن گذارتے تھے۔ سرنگ کے اندر گرمی نہیں تھی۔

مئی کی ایک رات تھی۔ ہم سب سو گئے تھے کہ خطرے کے سائرن کی تیکھی چیخوں نے جگا دیا۔ بھاگ دوڑ بھی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے جوانوں کے کیمپ سے تین جوان فرار ہو گئے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کو خبر ہو گئی ہے۔ شور و غل بڑھ رہا تھا۔ ہندوستانی افسروں نے ہمیں فال اِن، کر کے گنتی کی اور وہیں کھڑا رکھا۔ ہم پورے تھے مگر ہمیں پریشان کرنے کے لئے چھوڑا نہیں جا رہا تھا۔ وسلیں بج رہی تھیں۔ گاڑیوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کہیں کوئی کسی کو گالیاں دے رہا تھا اور کہیں کوئی سخت غصے میں بول رہا تھا اور ہم سب دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ ہمارے جو جوان بھاگ گئے ہیں وہ پکڑے نہ جائیں اور خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں۔

بہت دیر بعد ہمیں چھوڑا گیا۔ رات تو تقریباً گذر ہی چکی تھی۔ ذرا سی دیر سوئے اور اذان کی مقدس صدا پہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی روز ہمارے وہ تینوں جوان جو فرار ہوئے تھے ایک گاؤں میں پکڑے گئے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ دانشمندانہ منصوبہ بندی کے بغیر فرار ممکن نہیں ہوتا۔ دشمن کی قید سے نکلنا اور دشمن کے ملک میں چھپنے کی کوشش اور امید کرنا معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ جوان پکڑے گئے۔ ہمیں اگلے روز معلوم ہوا کہ انہیں بہت اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ یہ سزا غیر اخلاقی بھی ہے اور غیر قانونی بھی۔ عالمی قواعد و ضوابط کے مطابق جنگی قیدی کو فرار کا حق حاصل ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں اسے کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔

ہم نے گروپ کمانڈر کرنل موجمدار سے احتجاج کیا اور کہا کہ ہمارے تینوں جوانوں کو آزاد کر کے کیمپ میں بھیجا جائے۔ اس کمبخت نے اپنی ہندو ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ ان جوانوں پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ اس نے تشدد بند کرانے کا وعدہ کیا اور لکچر شروع کر دیا کہ ہمیں ہر طرح کی سہولت دی گئی ہے، پھر بھی ہم فرار ہونے کی کوشش کرتے اور اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتے ہیں۔ اس نے کہا۔ "اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔" ہم اسے سمجھا نہ سکے کہ اس کی وجہ ہمارے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اسیری میں سب کو بوریت کا سامنا تھا۔ روزمرہ کا معمول ایک ہی جیسا تھا۔ ماحول میں اور مصروفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ دراصل مصروفیت تو تھی ہی نہیں۔ یہی اصل مسئلہ تھا۔ میں نے افسروں کے مزاج میں اکتاہٹ اور چڑچڑاپن دیکھا جو حالات اور ماحول کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہ کیفیت ان افسروں کی تھی جو سرنگ کی کھدائی اور فرار کی سکیم میں شامل نہیں تھے۔ ہمارے لئے چونکہ فراغت نہیں تھی اس لئے بوریت بھی نہیں تھی۔ ہم ہر لمحہ مصروف رہتے تھے۔

اس بوریت کو ختم کرنے کے لئے افسروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ہفتے میں ایک دن جغرافیہ، تاریخ، معلوماتِ عامہ کے مقابلے کے لئے مقرر کیا گیا اور باقی دن معلومات فراہم کرنے میں صرف کئے جانے لگے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مہینے میں ایک دو بار سب ایک جگہ اکٹھے ہوں اور ہر

ایک اپنی زندگی کا کوئی انوکھا تجربہ یا مشاہدہ سنائے اور جو افسر غیر ممالک میں رہ آئے ہوں وہ وہاں کی باتیں سنائیں ــــ یہ طریقہ کامیاب رہا۔

مئی کے آخری ہفتے میں ایک دن بیس پچیس ہندوستانی افسر اور جوان اچانک آدھمکے۔ ہمیں بارک سے باہر نکال لیا گیا۔ سُرنگ کھودنے والے قبل از وقت اطلاع ملنے سے باہر نکل آئے۔ ہندوستانی بارک کے اندر چلے گئے۔ وہ تلاشی کے لئے آئے تھے آپ تصور میں لا سکتے ہوں گے کہ اس وقت ہماری جذباتی اور روحانی کیفیت کیا ہو گی۔ ہم باہر کھڑے تھے اور ہندو اندر تلاشی لے رہے تھے۔ انہوں نے دو گھنٹے اندر اور ارد گرد کے علاقے کو کھنگالا، ٹٹولا اور جب کچھ نہ ملا تو مایوس ہو کر چلے گئے۔

ایک روز گنتی کے وقت بتایا گیا کہ منشی نام کا ایک مسلمان جرنیل کیمپ کے معائنے کیلئے آرہا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ بھارتی جرنیل ہے، ہم اس پر خوش ہوئے کہ مسلمان تو ہے۔ کچھ کہے گا کچھ سنے گا، مگر وہ آیا تو اسے دیکھ کر ہی ہماری خوشی رنج میں بدل گئی معاً پتہ چلتا تھا کہ وہ آنہیں رہا اسے لایا جا رہا ہے۔ ہمارے کیمپ میں ہندو جرنیل بھی آئے تھے۔ ان کے ساتھ سٹاف کے دو چار افسر اور کیمپ کے ضروری افسر ہوتے تھے لیکن مسلمان جرنیل کے ساتھ بے شمار لوگ تھے۔ ان میں سے بعض کے چہرے غمازی کر رہے تھے کہ وہ انٹیلی جنس کے آدمی ہیں جو جنرل منشی کو نظر بندی کی حالت میں لائے ہیں تاکہ وہ کسی قیدی کے ساتھ مسلمان کی حیثیت سے بات نہ کر سکے۔

جنرل منشی کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس کے دل کی کیفیت اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ حیدر آباد دکن کا رہنے والا تھا۔ اور جب نظام آزاد تھا تو جنرل منشی اس کی فوج میں افسر تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ کوئی ایسی بات نہ کی جس سے پتہ چلتا کہ وہ آزادی سے بول رہا ہے۔ اسے ہمارے سامنے صرف یہ دکھانے کے لئے لائے تھے کہ انڈین آرمی میں مسلمان جرنیل بھی ہیں ــــ یہ مسلمان جرنیل آیا اور چلا گیا۔

گرمی اور زیادہ بڑھ گئی۔ بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔ راجپوت

رجمنٹ کے ٹریننگ سنٹر کے دو رنگروٹ لُو لگنے سے مر گئے۔ ان کی لاشوں کو وہیں جلایا گیا۔ ہم میں سے سب نے پہلی بار انسانوں کو جلتے ہوئے دیکھا ہے۔ خواہ وہ مرے ہوئے ہی تھے، مگر ہمیں یہ طریقہ بہت ہی مکروہ لگا۔ ہندو کے مذہب میں بھی بربریت اور درندگی ہے۔ ہم بھی ٹین کی چھت والی بارک میں زندہ جل رہے تھے۔

سُرنگ میں سے تو مٹی کسی نہ کسی طریقے سے نکالی جا رہی تھی۔ اسے باہر غائب کرنا مشکل ہو گیا۔ پہلے تو ٹھنڈ تھی۔ کمبل اوڑھ کر اس میں تھیلیاں چھپالی جاتیں اور گھر سے بیت الخلا میں خالی کر دی جاتی تھیں۔ اب اس قیامت کی گرمی میں کمبل نہیں اوڑھا جا سکتا تھا۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا گیا کہ افسر بیت الخلا میں لے جانے والے لوٹوں میں مٹی لے جانے لگے اور دوسرا طریقہ یہ کہ پانی والی بالٹیوں میں کچھ مٹی ڈالی جاتی۔ باقی بالٹی پانی سے بھری جاتی۔ مٹی اور پانی گھول کر بارک کے باہر چھڑکا دیا جاتا۔ اتنی شدید گرمی میں پانی چھڑکنے پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر ایک اور مشکل پیدا ہونے لگی۔ ہمارے فلش سسٹم والے بیت الخلا بننے لگے۔ ان کے مکمل ہوتے ہی خندق والے بیت الخلا کو بند ہو جانا تھا۔ تاہم ہم نے یہ فائدہ اٹھایا کہ رات کو سیمنٹ چوری کر لیا اور اس سے ایک سیلب SLAB بنا لیا۔ اس کا سائز سُرنگ کے دہانے کے مطابق رکھا گیا۔ اس سے دہانے کو چھپانا تھا۔ یہ کارنامہ ہمارے انجنیئر افسروں کا تھا۔ سیلب تیار ہو گیا تو دہانے کو چھپانا اور زیادہ آسان ہو گیا۔

ہندوستانیوں نے پروپگنڈے کا ایک اور اوچھا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے قومی شاعر "سردار جعفری" کو ہمارے پاس بھیجا اور اس کا کلام سنوایا۔ اس مسلمان شاعر نے ایک نظم سنائی جس کا عنوان تھا "دشمن کون" اور اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان نے کئی بار غیروں سے ہتھیار لے کر ہندوستان پر فوج کشی کی ہندوستان کو بادل نخواستہ جوابی کارروائی کرنی پڑی اور آخر پاکستان کی پیہم فوج کشی کو ختم کرنے کا ایک حل نکالا۔ غرض جعفری صاحب نے دل کھول کر پاکستان کے خلاف زہر اگلا۔ نظم ختم ہوتے ہی قیدی افسروں نے اس کا جو حشر کیا اسے وہ ساری عمر نہیں بھولے گا۔ اس

نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی۔

پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کے ایک مسلمان پروفیسر بنائی صاحب تشریف لائے انہوں نے دو گھنٹے ہندوستان کے سیکولرازم پر اور ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پر لکچر دیا جس میں ہندوستان کو برتر اور پاکستان کو کمتر ثابت کیا گیا۔ اس لکچر کی ابتدا پاک فوج کی شجاعت اور مدح سرائی سے کی گئی تھی۔ لکچر ختم ہوا تو پاکستانی افسروں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کی حالت ایسی قابل رحم ہوئی کہ اسے یہ کہنا پڑا کہ میں تو صرف علمی باتیں کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، سیاسی معاملات کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ بہر حال وہ بھی بری طرح ناکام ہو کر چلا گیا۔

ہماری سرنگ
دشمن کے ہتھکنڈے

جہاں تک افسروں کا تعلق تھا ان میں سے کوئی بھی ایسے پروپیگنڈے اور اس قسم کے ہتھکنڈوں سے متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ ہمیں جوانوں کے متعلق پریشانی تھی کہ ان میں کوئی جذبات میں آکر متاثر نہ ہو جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جوانوں نے ہمارا یہ خدشہ دور کر دیا۔ انہوں نے ان مسلمان "مبلغوں" کا جو حشر کیا اسے میں صرف ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

پروفیسر بنائی نے جوانوں کو کم وبیش ڈیڑھ گھنٹہ وعظ سنایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کے لئے ہندوستان سے جنگ کرنا کسی پہلو مفید نہیں بلکہ سخت نقصان دہ ہے۔ اس سے پاکستان کا وجود ناپید ہو جائے گا۔ اس نے بے بنیاد واقعات سنانے کے بعد پوچھا۔ "کیا اب بھی آپ لوگ ہندوستان سے لڑیں گے؟"

جوانوں پر خاموشی طاری ہو گئی۔ بنائی بھی خاموش رہا۔ ایک آدھ منٹ کے سکوت کے بعد ایک پاکستانی حوالدار اٹھا اور بولا۔ "جناب عالی! اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے میں آپ کے سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔"

"جی ہاں!" پروفیسر بنائی نے کہا۔ "آپ جواب دیں۔"

"ہم لوگ ایک باقاعدہ فوج کے سپاہی ہیں۔" حوالدار نے کہا۔ "ہماری فوج کا ڈسپلن بے مثال ہے۔ ہم اپنے سینیئر افسروں پر اعتماد رکھتے ہیں اور افسروں کو ہمارا اعتماد حاصل ہے۔ ہمیں اعلیٰ افسروں نے ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا اور ہم نے ہتھیار اٹھائے۔ انہوں نے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو ہم نے ان کا یہ حکم بھی مانا۔ اب آپ ہم سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان جا کر ہم ہندوستان کے خلاف لڑیں گے یا نہیں۔ عرض یہ ہے کہ پاکستان جانے کے بعد حالات ہی کچھ اور ہونگے مگر ہمارے افسر اگر ہمیں ہمیں خالی ہاتھ لڑنے کا حکم دیں تو ہم انشاء اللہ انکے حکم کی تعمیل میں جان کی بازی لگا دیں گے۔"

اس جواب کے بعد پروفیسر بنائی کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مایوسی اور شکست سے اس کا چہرہ لٹک گیا اور وہ چلا گیا۔

سرنگ میں پانی آگیا

ہم نے سرنگ پچاس گز تک پہنچا دی۔ دشمن کو خبر تک نہ ہوئی۔ سرنگ میں حبس کم کرنے کے لئے ہم نے اوپر کی طرف چند اور سوراخ کر لئے۔ لیکن یہ سوراخ فائدے کے ساتھ ایک نقصان بھی پہنچانے لگے۔ وہ اس طرح کہ بارشیں شروع ہو گئیں۔ ایک روز سرنگ کی کھدائی کے لئے گئے تو اندر پانی آگیا تھا جو سوراخوں میں سے آیا تھا۔ اس سے کھدائی مشکل ہو گئی۔ ہم نے اس کا ایک علاج یہ کیا کہ پانی پر خشک مٹی پھینک کر کچھ دیر انتظار کرتے اور ذرا خشک ہو جانے کے بعد کھدائی کرتے تھے۔ اس مشکل نے کھدائی کی رفتار بہت ہی کم کر دی۔

بوریت ختم کرنے کے لئے ہم نے راتوں کو قوالی اور مشاعرے شروع کر دیئے۔ یہ تھا تو مذاق لیکن مذاق مذاق میں ہم میں سے چند ایک اچھے رستم نکل آئے۔

ان میں کوئی کلو قوال تھا اور کوئی غالب اور میر درد۔ یہ بڑی دلچسپ دریافت تھی
جس نے کیمپ کی زندگی سے بوریت کم کردی مگر ہمارے ہندوستانی میزبانوں کے لئے
یہ ہنگامہ ہوتا تھا جو انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن وہ ہمیں روک نہیں سکتے تھے۔ البتہ
کسی نہ کسی طرح اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

ہم نے ایک دلچسپی اور پیدا کر لی۔ ہمیں ریڈیو ٹرانسسٹر مل گئے۔ شام کے بعد ہم
بارک سے باہر کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ درمیان میں ایک ٹرانسسٹر رکھ کر ریڈیو
آزاد کشمیر لگا کر آواز انتہائی اونچی کر دیتے۔ آپ جانتے ہیں کہ آزاد کشمیر سے ہندوستان
کی کیا گت بنا کرتی ہے۔ ہمیں ایک تو اس پروگرام سے لطف حاصل ہوتا تھا۔ لیکن
اصل لطف تو ہمیں ذہنی اذیت سے حاصل ہوتا تھا جو اس پروگرام سے ہندوستانی
سنتریوں وغیرہ کو پہنچتی تھی۔ یہ اذیت ان کے چہروں پر لکھی ہوتی تھی۔ مگر وہ ہمیں کہہ
نہیں سکتے تھے کہ ہم ٹرانسسٹر بند کردیں یا آزاد کشمیر کے پروگرام نہ سنیں یا آل انڈیا ریڈیو سنیں۔

جون ۱۹۷۲ء کا مہینہ شروع ہو گیا۔ گرمی بھی زیادہ اور بارشیں بھی زیادہ ہونے
لگیں۔ سرنگ میں اتنا زیادہ پانی بھرنے لگا کہ مٹی کی بجائے ہم سرنگ سے پانی نکالتے
تھے۔ دو دو دن اسی کام میں گذر جاتے اور کھدائی ایک انچ نہ ہوتی۔ اس قدر
نمی اور پانی میں کام کرتے کرتے ہمارے جسم کمزور ہونے لگے۔ کبھی کبھی خاصی
نقاہت محسوس ہوتی تھی لیکن فرار کا جذبہ ایسا شدید تھا کہ ہم آخری سانس تک فرار
کے ارادے سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ یہ اسی جذبے کا کرشمہ تھا کہ اتنے کمزور
جسموں سے اتنی زیادہ دشواریوں اور خطروں میں ہم سرنگ کھود رہے تھے۔ فرار ایک
خواہش نہیں عزم تھا۔

بھٹو، اندرا گاندھی اور ہماری سرنگ

ہمیں جہاں تک سرنگ کو پہنچانا تھا وہاں کھلا میدان تھا۔ ہم نے اندازہ کیا تھا

کہ ہمیں دو سو گز لمبی سرنگ کھودنی پڑے گی جس کے لئے دو سال کا عرصہ درکار تھا۔ لیکن
بارشوں نے جہاں ہماری کھدائی میں دشواری پیدا کر دی وہاں یہ کرم بھی کیا کہ گھاس
اگنی اور بڑھنی شروع ہو گئی۔ پھر گھاس اتنی اونچی ہو گئی کہ اس میں چھپا جا سکتا تھا۔
قدرت کی اس کرم نوازی سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ سرنگ اتنی
دور تک نہ لے جائیں بلکہ خاردار تار کی سب سے باہر والی باڑ سے کم از کم دس
اور زیادہ سے زیادہ پندرہ گز دور تک لے جائیں وہاں سے نکلیں تو گھاس ہمیں
چھپا لے گی۔

اس دوران خبر ملی کہ ذوالفقار علی بھٹو اندرا گاندھی سے مذاکرات کے لئے دلی آ
رہے ہیں۔ بعد میں مذاکرات کا مقام شملہ قرار پایا۔ میرے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلسل
کھدائی کرنے سے جو جسمانی اور اعصابی تھکن ہوتی ہے اسے کچھ سکون دینے کے لئے سرنگ
کی کھدائی ملتوی کردی جائے اور مذاکرات کے نتائج کا انتظار کیا جائے۔ موہوم سی
امید تھی کہ مذاکرات کی کامیابی ہماری رہائی کا باعث بنے گی۔

پھر مذاکرات شروع ہو گئے۔ ہم خبروں کا انتظار بے تابی سے کرتے تھے اور بڑی
غور سے خبریں سنتے تھے۔ ان پر بحث مباحثہ کرتے اور ہر کوئی اپنی رائے دیتا تھا۔
پانچ چھ دن کے مذاکرات کے بعد ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا۔ مذاکرات کے جاری رہنے
کا امکان کم ہی نظر آتا تھا۔ ان خبروں کے ساتھ ایک اخبار نے یہ خبر شائع کر کے
ہمیں بلکہ سارے پاکستان کو شرمسار کر دیا کہ ہمارے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ
جو لوگ آئے ہیں، ان میں بیشتر دھڑا دھڑ ہندوستانی فلموں کے گیتوں کے ریکارڈ
خرید رہے ہیں۔ یہاں تک کہ شملہ میں ریکارڈ ختم ہو گئے تو دلی سے مزید ریکارڈ منگوائے
گئے تاکہ پاکستانی وفد کی مانگ پوری کی جا سکے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس خبر میں کتنی کچھ صداقت تھی مگر میں اسے جھٹلا بھی نہیں
سکتا۔ میں نے پاکستان میں آ کر ہندوستانی فلموں کے ریکارڈوں کا جو جنون اور خبط
دیکھا ہے اس کے پیش نظر مجھے وہ خبر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے بھائیوں نے

تو ریکارڈ طور پر کرا اپنا "ذوقِ بدؔ" پورا کر لیا تھا مگر قیدی کیمپ میں ہمیں ہندوستانیوں کے سامنے جس شرمندگی سے دوچار ہونا پڑا اور ہنسی ہنسی میں ہمیں جو طعنے دیئے گئے اس کی پیدا کردہ روحانی اذیت کو ہمارے سوا اور کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔

شملہ مذاکرات کا تعطل ہمیں پریشان کرتا رہا۔ ان کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ غیر ملکی مبصر بھی لکھتے تھے کہ مذاکرات کی ناکامی کے امکانات زیادہ ہیں۔ ہماری امیدیں بجھنے لگیں۔ ہم نے سرنگ کا دہانہ حسبِ معمول سیمنٹ کے سلیب سے بند کر دیا تھا۔ مذاکرات کی طرح ہمارا کام بھی التوا اور تعطل میں پڑا تھا۔ ہم نے ایک روز سلیب کو دیکھا تو محسوس کیا کہ اوپر سے کوئی ضرب لگائے تو ضرب کی آواز سے صاف تپہ چل جائے گا کہ نیچے خلا ہے۔ سرنگ کی سراغرسانی کے لیئے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جہاں سرنگ کا شک ہو وہاں اوپر گدھر کی ضرب لگاؤ تو نیچے سرنگ کی صورت میں آواز ٹھوس زمین کی نسبت مختلف ہوتی ہے۔ ہم نے سلیب اٹھا کر نیچے مٹی کے بھرے ہوئے تھیلے رکھ دیئے اور ایک لکڑی کا سہارا بھی دے دیا۔ اس انتظام کے بعد اوپر کی ضرب بتاتی تھی کہ نیچے زمین ٹھوس ہے۔

شملہ مذاکرات جنہیں بعد میں شملہ کانفرنس کہا گیا ہے کے ڈرامائی نتائج سنے مگر جنگی قیدیوں کے متعلق کوئی واضح اعلان نہ کیا گیا۔ قیدی کیمپ پر نا امیدی اور مایوسی طاری ہو گئی۔ ایک غیر یقینی سی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارے لئے یہ مایوسی تازیانہ ثابت ہوئی۔ ہم نے سرنگ کو نئے عزم اور حوصلے سے آگے بڑھانے کا تہیہ کر لیا۔ ہم نے رستا بھی لیا تھا۔

سرنگ میں سانپ

جون کا مہینہ گزر گیا تھا۔ جولائی ۱۹۷۲ء کے آغاز کا ایک دن طلوع ہوا تو تلاشی لینے والی پارٹی آ گئی۔ صبح کی گنتی (رول کال) کے وقت ڈیوٹی آفیسر کے ساتھ چار افسر اور دو درجن جوان بھی آ دھمکے۔ ہم بارک سے باہر تھے وہ سب بارک میں چلے گئے۔

ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اندر سے ہمیں جو آوازیں اور ضربوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے وہ ہمارا دم خشک کرتے تھے۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ سرنگ کے دہانے کا سراغ لگانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ لوگ غسلخانوں میں بھی گئے۔ لمبے گھنٹوں کی طوالت سے گزر رہے تھے۔ ہم سب دل ہی دل میں خدائے ذوالجلال سے مدد کی التجا کر رہے تھے۔ اسی کی ذاتِ باری کا سہارا تھا۔ ہم کتنی کچھ احتیاط کر سکتے تھے۔ کسی نہ کسی روز تو پکڑے جانا ہی تھا۔ یہ تو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کا خاص کرم تھا کہ ہم بچے ہوئے تھے اور ہندوستانی سرنگ کے منہ پر کھڑے ہو کر بھی اندھے ہو جاتے تھے۔ جولائی کی اس صبح بھی انہوں نے مسلسل دو گھنٹے تلاشی لی۔ تلاشی کا سب سے بڑا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اگر سرنگ کھودی جا رہی ہے تو پکڑ لیں۔

تلاشی تو لی جا چکی تھی۔ پھر پانچ چھ گھنٹے گزر گئے مگر ہمیں اندر جانے کی اجازت نہ ملی۔ اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ انہوں نے سرنگ کا کھوج پا لیا ہے اور ہمارے لئے سزا اور دیگر تادیبی کارروائی تجویز ہو رہی ہے۔ ہمیں ناشتہ بھی نہ کرنے دیا گیا اور پانی تک پینے کی اجازت نہ دی گئی۔ ہندوستانی افسروں سے اس سلوک کی شکایت کی تو انہوں نے ٹال دیا۔ ڈیڑھ بجے کے بعد انہوں نے افسروں کی جامہ تلاشی شروع کر دی۔ ہر ایک کی تلاشی لیتے اور الگ بھیج دیتے۔ ہندوستانی افسروں نے اپنی کمینگی کا اظہار اس اوچھے طریقے سے کیا کہ ہم نے اندر سے اپنی کرسیاں لانے اور بیٹھنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اندر سے کرسیاں لا کر خود ان پر بیٹھ گئے۔

ہمیں آٹھ نو گھنٹے دھوپ میں بھوکا پیاسا کھڑا رکھ کر انہوں نے اندر جانے کی اجازت دی۔ اندر کی حالت ایسی تھی جیسے بارک میں لوٹ مار ہوئی ہو۔ ہمارے کپڑے ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ بستر اٹھا اٹھا کر پھینکے گئے تھے۔ ہمارا جو مختصر سا سامان تھا وہ بھی بکھیر دیا گیا۔ کئی جگہوں سے زمین کھودی گئی تھی۔ ہم نے غسلخانے میں جا کر دیکھا۔ سرنگ بند تھی۔ سلیب اپنی جگہ پڑا تھا۔ بدبختوں کو یہاں کچھ بھی نظر

نہیں آیا تھا۔ تب ہم نے سوچا کہ چونکہ انہیں یہاں سے کچھ بھی نہیں ملا تھا اس لئے خفت مٹانے اور ہمیں پریشان کرنے کی خاطر انہوں نے ہمیں سارا دن باہر دھوپ میں کھڑا رکھا تھا۔

جولائی کے تیسرے ہفتے تک بارشیں اور زیادہ ہونے لگیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ گھاس تیزی سے اونچی اور گھنی ہونے لگی۔ امید تھی کہ ایک ماہ تک تین فٹ سے اوپر نکل جائے گی۔ ہم نے سرنگ سے سلیب اٹھایا۔ لکڑی اور مٹی کے تھیلے نکالے اور اللہ کا نام لے کر ایک بار پھر سرنگ میں گھس گئے۔ ان تین دنوں میں سرنگ میں اتنا پانی جمع ہو چکا تھا کہ اسے نکالتے دو دن لگ گئے۔ مزید دو دن سرنگ خشک ہونے کا انتظار کیا۔ پانی باہر لانا بڑا تکلیف دہ اور وقت طلب کام تھا۔

چوتھے دن ہمارا ایک ساتھی کھدائی کے لئے اندر گیا۔ اس کے پاس روز مرہ کی طرح ٹارچ تھی، جس میں ٹرانسسٹر کے سیل ڈال رکھے تھے۔ ہمارا ساتھی واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔ اس نے بتایا کہ سرنگ میں دور آگے ایک سانپ بیٹھا ہوا ہے۔ سانپ چھوٹے سائز کا بتایا گیا تھا۔ اس سے ہم اور زیادہ ڈرے کیونکہ چھوٹے سائز کا سیاہ سانپ زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔

یہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ ہم نے سوچا کہ اچھا ہوا سانپ دیکھ لیا گیا ہے۔ اگر اس کا بل سرنگ میں ہی ہے تو یہ ہمیں بے خبری میں کاٹ سکتا تھا۔ اور اب خطرہ یہ تھا کہ سانپ بل میں چلا گیا تو سرنگ کی کھدائی ختم کرنی پڑے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا تو مہینوں کی محنت رائیگاں گئی۔ میرے ساتھی افسروں نے اسی وقت سانپ کو مارنے کے مسئلے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اندر تو ایک ہی افسر جا سکتا تھا۔ اس کی مدد کے لئے دوسرا بھی جا سکتا تھا مگر وہ کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ دو فٹ چوڑی سرنگ میں یہی مدد ہو سکتی تھی کہ اگلے افسر کو سانپ ڈس لیتا تو دوسرا اسے گھسیٹ کر باہر لے آتا۔

جذبے کا یہ عالم تھا کہ جب اندر جانے والوں کا انتخاب ہونے لگا تو ہر ایک افسر نے اپنے آپ کو اندر جانے اور سانپ کو مارنے کے لئے پیش کیا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ ہم میں سے جو فرار کی سکیم میں شامل تھے جو دو سینئر ہیں وہ اندر جائیں اس فیصلے کے مطابق دو افسر اندر گئے۔ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ اندر کوئی سانپ نہیں ہے۔ یہاں پھر جذبے اور زندہ دلی کا مظاہرہ ہوا۔ ڈرنے کی بجائے سب نے اس افسر کا مذاق اڑایا جس نے اطلاع دی تھی کہ اندر سانپ بیٹھا ہے۔ ہم کہتے تھے کہ وہ کوئی اور چیز دیکھ کر ڈر گیا ہے۔

دوسرے دن جو افسر کھدائی کے لئے اندر گیا۔ اس نے آ کر اطلاع دی کہ سانپ اندر مرا پڑا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا اور سانپ کی موت کو ہم اللہ کی خوشنودی کا پیغام سمجھے۔ ہمارے راستے میں آنے والے سانپ کو خدا کے سوا اور کون مار سکتا تھا۔ ہمارے حوصلے اور زیادہ بلند ہو گئے۔ کھدائی ایک بار پھر شروع ہو گئی اور مٹی بھی پہلے کی طرح غائب ہونے لگی۔

غسل خانوں کے باہر بارک کے قریب ہی گہرا اور خاصا چوڑا گڑھا تھا۔ غسل خانوں کا پانی اس میں جمع ہوتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے بارک کی دیوار میں نمی چڑھ گئی۔ ہندوستانیوں نے دیکھ لیا کہ دیوار کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایک روز ہندوستانی افسر اچانک غسل خانوں کے معائنے کے لئے آ گئے۔ اس وقت ایک افسر سرنگ کے اندر کھدائی کے لئے گیا ہوا تھا اور میں غسل خانے میں سرنگ کے کھلے ہوئے دہانے پر بیٹھا تھا۔ میجر طارق نے مجھے اطلاع دے دی کہ ہندوستانی آ رہے ہیں۔ مگر وہ ایسے اچانک آئے کہ کھدائی کرنے والے کو باہر نکالنا اور دہانہ بند کرنا کسی پہلو ممکن نہیں تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ ہم رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے تھے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں دہانے پر سلیب رکھ دیتا۔ اگر میں گھبراہٹ میں ایسا کرتا تو اندر والا افسر دم گھٹنے سے مر جاتا۔

ہندوستانی افسر اندر آ گئے۔ مجھے ان کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ وہ آتے ہی

پہلے غسلخانے میں داخل ہونے لگے۔ میں وہیں تھا۔ میجر طارق نے انہیں کہا کہ اس میں تو کوئی نہا رہا ہے، آپ دوسرے غسل خانے دیکھ لیں۔ میں نے بالٹی سے ایسی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ جیسے میں نہا رہا ہوں۔ یہ بھی ایک معجزہ ہوا کہ ہندوستانی چار غسل خانے دیکھ کر چلے گئے۔

اگست کے مہینے میں بارشوں میں کمی آنے لگی۔ کھدائی آسان ہو گئی۔ اور ہر طرف اونچی گھاس نظر آنے لگی۔ انہی دنوں اولمپک گیمز ہو رہی تھیں۔ ایک روز ہندوستان اور پاکستان کی ہاکی ٹیموں کا میچ تھا۔ تمام افسر کمنٹری سننے کے لئے ریڈیو کے گرد جمع ہو گئے۔ ہمارے جوانوں کو کمنٹری سنانے کے لئے ہندوستانیوں نے لاؤڈ سپیکروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ کھیل شروع ہوا۔ ہر کوئی اپنی ٹیم کی کامیابی کے لئے دعا گو تھا۔ ہم پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ ہم یہ سننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ ہندوستانی ٹیم جیت گئی ہے۔ اللہ نے ہماری دعائیں قبول فرمائیں۔ پاکستانی ٹیم نے پہلا گول کر دیا۔ قیدیوں پر یہ کیفیت طاری ہو گئی کہ بارکوں سے باہر آ کر بھنگڑہ ناچنے اور نعرے لگانے لگے۔

پھر ہماری ٹیم نے دوسرا گول بھی کر دیا۔ ہندوستانیوں نے یہ اوچھی حرکت کی کہ لاؤڈ سپیکر بند کر دیئے۔ میچ ابھی جاری تھا۔ ہمارے پاس تو اپنے ٹرانسسٹر تھے۔ جوان باقی کمنٹری سننے سے محروم رہے۔ میچ ختم ہو گیا۔ پاکستان کی ٹیم دو گولوں سے جیت گئی تھی۔ ہندوستانی ٹیم ایک بھی گول نہیں کر سکی۔ ہم سب نے باہر آ کر ناچنا شروع کر دیا۔ جوانوں نے الگ اودھم بپا کر دیا۔ نعروں سے آسمان کانپنے لگا۔ ہندوستانی سنتری بڑی حیرت سے ہمیں دیکھ رہے تھے اور وہ پشیمان سے بھی تھے۔

سانپ گیا
ہندو افسر آگئے

ایک شام ایک انوکھا اور جگہ پاش حکم ملا۔ حکم یہ تھا کہ کل تمام قیدیوں کو

کسی دوسرے کیمپ میں منتقل کیا جا رہا ہے، اس لئے صبح سویرے اپنے تمام سامان کے ساتھ سفر کے لئے تیار رہیں۔ ہم سب افسر ایک جگہ بیٹھ گئے اور اس حکم کا تجزیہ کرنے لگے۔ یہ دراصل فہم و فراست کی جنگ تھی۔ ہم نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ اتنے زیادہ افراد کو ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں منتقل کرنا ممکن نہیں اور اس اجتماعی منتقلی کا کوئی جواز بھی نہیں۔ ہم میں سے بیشتر نے یہ رائے قائم کی کہ ہندوستانیوں کو بجا طور پر شک ہے کہ ہم نے کوئی قیمتی چیزیں اور رقم کہیں چھپا رکھی ہے۔ وہ کئی بار تلاشی لے کر ناکام ہو چکے ہیں۔ اب انہوں نے اس توقع پر منتقلی کا حکم دیا ہے کہ ہم چھپائی ہوئی چیزیں وغیرہ نکال کر اپنے پاس رکھ لیں گے اور ہندوستانی کل صبح ہماری تلاشی لے کر یہ چیزیں لے جائیں گے۔

ہم سب نے فیصلہ کیا کہ زمین میں دبائی ہوئی چیزیں نہ نکالی جائیں۔ ہم نے اللہ پر چھوڑ دیا کہ جیسے اسکی ذات باری کو منظور ہو گا۔ اور ویسے ہی ہوا۔ ہم اگلی صبح اپنا سامان سمیٹ کر سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ ہندوستانی افسر آئے۔ انہوں نے ہماری جامہ تلاشی لی۔ سامان کھول کر دیکھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہیں سے بھی زمین کھودی ہوئی نہیں تھی۔ انہیں جو مایوسی اور خفت ہوئی وہ اُن کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح ناکام ہوئے اور چلے گئے۔

ہمارا اندازہ صحیح نکلا۔ منتقلی کا حکم ایک چال تھی جسے ہم نے ناکام بنا دیا۔

اگست کے دوسرے ہفتے میں ہمیں حکومتِ پاکستان کے بھیجے ہوئے تحائف کے پیکیٹ موصول ہوئے۔ ہر افسر اور جوان کے لئے ایک ہی جیسی اشیاء تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

دو سلیپنگ سوٹ، دو بنیان۔ دو رومال۔ ایک دانتوں کا برش۔ ایک کنگھی۔ ایک جوڑا کینوس شوز۔ دو سو گولیاں ملٹی وٹامن۔ ایک رائٹنگ پیڈ۔ ایک قلم۔ ایک پیکٹ بلیڈ۔ دو ڈبے بسکٹ۔ دو جوڑے گرم جرابیں ایک ٹیوب ٹوتھ پیسٹ۔ دو تولئے دو انڈرویئر

اور ایک جوڑا ہوائی یا چمڑے کا چپل۔

ان اشیاء میں سے ہندوستانیوں نے تمام پیکٹوں سے رائٹنگ پیڈ اور قلم نکال لئے۔ اس کا انہوں نے جواز پیش کیا کہ قیدی یہاں سے ایسی معلومات لکھ کر لے جائیں گے جو زبانی یاد نہیں رکھی جا سکتیں، اور جو یہاں سے باہر نہیں جانی چاہئیں۔ یہ محض ایک بہانہ تھا ہمیں پریشان کرنے کا اور ہماری اشیاء ہضم کرنے کا۔

اگست کے آخری ہفتے تک ہماری سُرنگ خاردار تار کی آخری باڑ سے سات آٹھ فٹ آگے نکل گئی۔ ہم اوپر سے اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ سُرنگ کہاں تک پہنچی ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق سرنگ سطح زمین سے آٹھ فٹ نیچے تھی۔ آخر میں ہمیں اسے اوپر کو یعنی عمودی لے جانا اور اوپر کو دہانہ کھولنا تھا۔ ہم نے سوچا کہ آٹھ فٹ گہرائی سے اوپر چڑھنا ممکن نہیں ہو گا، چنانچہ ہم نے سُرنگ کو زمین سے کچھ زاویے پر اوپر لے جانا شروع کر دیا تاکہ یہ کنوئیں کی طرح عمودی نہ بنے، ڈھلانی بنے۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ زمین تین چار فٹ رہ جائے تو اسے عمودی کر دیا جائے۔

کھدائی مکمل ہو گئی

ستمبر ۱۹۷۲ء کا مہینہ آگیا۔ گھاس کی بلندی زمین سے چار فٹ تک تھی۔ ہمیں پوری توقع تھی کہ روشنی کے باوجود ہمیں گھاس چھپا لے گی۔ سُرنگ سے نکلنے والا دہانہ گھاس میں ہی کھولنا تھا۔ یہ سُرنگ کا آخری مرحلہ تھا۔ فرار کے جنون، رہائی کے جذبے اور ہیجانی کیفیت نے مل جل کر ہمیں ذہنی طور پر نارمل نہ رہنے دیا۔ اس کیفیت میں پکڑے جانے کے تصور سے ہی ہمارے دلوں کی دھڑکنیں رک جاتی تھیں۔ ہم کچھ مشکل سے اپنی ذہنی کیفیت پر قابو پاتے اور آخری کھدائی میں مگن ہو جاتے تھے۔ اوپر سنتری اور خونخوار کتے پھرتے رہتے تھے۔ ٹاوروں کے سنتریوں کی نظریں
ہم پر منڈلاتا رہتا تھا۔
ہم پر لگی رہتی تھیں۔ اچانک چیکنگ کا بھوت ہر لمحہ

ہم پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے کھدائی کرنے لگے۔ مٹی نکالنے کا کام اور زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ سُرنگ دو سو دس فٹ لمبی ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں موڑ بھی تھے۔ وہاں تھیلا رک جاتا تھا۔ اتنا لمبا فاصلہ رینگ کر طے کرنا پڑتا تھا۔ کہنیوں اور گھٹنوں کے زخم ٹھیک ہونے کی بجائے کھلتے جا رہے تھے۔ اور ہم ہندو جیسے اوچھے دشمن کی قید سے رہائی کی لگن سے سرشار آخری کھدائی میں لگے ہوئے تھے۔

۱۶ ستمبر کے روز ہمیں دیکھنا تھا کہ سرنگ کا دہانہ کہاں کھلے گا۔ دوپہر کا وقت موزوں تھا کیونکہ یہ وقت ہندوستانی افسروں اور دیگر افراد کے آرام کا وقت تھا۔ ہمارا ایک ساتھی سُرنگ میں چھری لے کر گیا۔ اس وقت تک سُرنگ کی کھدائی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے دوسری طرف اوپر اتنا سا سوراخ کیا جہاں سے سر نکالا جا سکتا تھا۔ ہمارے ساتھی نے سر باہر کر کے دیکھا اس نے واپس آ کر بتایا کہ دہانہ اونچی گھاس میں کھلا ہے۔ کوئی سنتری اُسے نہیں دیکھ سکا۔ مگر سنتریوں کی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنتریوں کے خیمے سُرنگ کے دہانے کے قریب ہی ہیں۔

سُرنگ مکمل ہو گئی۔ اُدھر سے دہانہ بھی کھل گیا۔ ہم نے ۱۷ ستمبر ۱۹۷۲ء کی رات فرار کے لئے مقرر کی۔ سارا دن ہیجان اور بے چینی میں گذرا۔ ذہنی طور پر ہم ایک ایسے سفر کی تیاری کر رہے تھے جس کی منزل تو ہمیں معلوم تھی، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس منزل تک پہنچ سکیں گے یا نہیں۔ راستہ موت کی وادیوں سے گذرتا تھا۔ ہم نے ذہنی طور پر تیاری کر لی جو یہ تھی کہ تمام تر خطروں کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ ہم نے جو قیمتی چیزیں چھپا رکھی تھیں وہ نکال کر اپنے جسموں کے ساتھ کپڑوں میں چھپا لیں۔ فرار شام کی گنتی کے بعد ہونا تھا۔ میرے لئے ایک مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ میری پتلون جو میں نے فرار کے لئے رکھی تھی بُری طرح خراب ہو گئی تھی۔ میں نے پلنگ کی چادر پھاڑ کر ہاتھ سے پاجامہ تیار کر لیا تھا۔

شام کی گنتی خیریت سے ہو گئی۔ ہم نے وضو کیا اور مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر اللہ کے حضور گڑگڑا کر کامیابی کی دعا مانگی۔ اس کے بعد میں نے، میجر طارق پرویز اور میجر نادر پرویز نے وہ کپڑے پہن لئے جو ہم نے کھدائی کے لئے استعمال کئے تھے۔ وہ کپڑے جو ہم نے ہندوستان میں گھومنے پھرنے کیلئے قیدی کیمپ کے بڑے بڑے سیاہ نشانوں سے بچا کے رکھے ہوئے تھے وہ الگ باندھ لئے۔ یہ ہمیں سرنگ کے باہر والے دہانے سے نکل کر بدلنے تھے۔

سرنگ کا غسل خانے والا دہانہ کھول دیا گیا اور ہم تینوں باقی افسروں سے رخصت ہو کر روانہ ہونے لگے۔ وہ منظر بڑا ہی جذباتی تھا۔ کیمپ میں رہنے والے ساتھی ہمیں کامیابی کی دعائیں دے رہے تھے۔ ہمیں ان سے جدا ہونے کا دکھ بھی تھا، اور رہائی کی خوشی بھی۔ ایسے ملے جلے جذبات میں سب سے پہلے میجر نادر پرویز سرنگ میں اترے، ان کے پیچھے میجر طارق پرویز اور اس کے پیچھے میں اترا۔ ہم رینگنے کے عادی ہو گئے تھے۔ دوسرے سرے تک جا پہنچے۔ میجر نادر پرویز نے سرنگ کا دہانہ کھلا کرنا شروع کر دیا اور ہم مٹی پیچھے کو ہٹانے لگے۔ سرنگ تنگ تھی۔ مٹی اسے اور تنگ کر رہی تھی۔

میجر طارق پرویز پھنس گئے

میجر نادر پرویز باہر نکل گئے۔ دہانے کا قطر سرنگ کی نسبت کم تھا اور میجر طارق پرویز کا قطر کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ سرنگ کے دہانے کے نیچے ہی پھنس گئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں پیچھے سے انہیں دھکا لگاؤں۔ میں ان کے پیچھے تھا۔ پوری طاقت سے انہیں دھکیلا مگر وہ نکلنے کی بجائے اور زیادہ پھنس گئے۔ کہنے لگے کہ نیچے کھینچو۔ اب انہیں پیچھے کو نکالنا محال ہو گیا۔ خاصی دھینگا مشتی اور کھینچا تانی سے انہیں نیچے کھینچا۔ انہیں دراصل کھدی ہوئی مٹی پکڑے ہوئے تھی۔ انہوں نے مٹی پیچھے پھینکنی شروع کی تو مٹی میری آنکھوں میں اور منہ پر پڑنے لگی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے سرنگ عمودی ہو جاتی تھی۔

خدا خدا کر کے میجر طارق اس مرحلے سے اوپر چلے گئے مگر دہانے میں جا کر پھنس گئے۔ میجر نادر نے انہیں اوپر سے اپنی ٹانگ پکڑائی، نیچے میں نے دھکا لگایا اور طارق پرویز کو باہر نکالا۔ اب میری باری تھی۔ میرا جسم دبلا پتلا ہے جو اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن سرنگ سے نکلتے وقت میں نے محسوس کیا کہ دبلا پتلا جسم کتنی بڑی نعمت ہے۔ میں بڑی آسانی سے سرنگ سے باہر نکل گیا۔ آزادی کی ہوا کے پہلے ہی جھونکے نے جسمانی اور ذہنی تھکن اور کوفت دور کر دی۔ اب ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنے تھے۔ گھاس نے ہمیں چھپا لیا تھا۔ رات کا اندھیرا کیمپ کی روشنیوں کی وجہ سے کم تھا۔ ہم نے ادھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ باہر والا سنتری ہم سے بمشکل پندرہ گز دور کھڑا تھا۔ دائیں طرف بیس پچیس گز دور سنتریوں کے خیمے تھے۔ ہمیں ان کی باتیں سنائی دے رہی تھیں اور سنتری کی حرکتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ سرچ لائٹوں اور کیمپ کی دوسری روشنیوں سے ہمیں گردوپیش کو دیکھنے میں مدد مل رہی تھی۔

کیمپ کے اندر اور باہر کے سنتریوں کا دھیان کیمپ کے اندر کی طرف کرنے کے لئے ہم سب نے ایک انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے تحت جو افسر بارک میں رہ گئے تھے انہوں نے بے تکا شور شرابہ اور غل غپاڑہ بپا کر دیا۔ اس سے تمام سنتریوں کا دھیان اُس طرف ہو گیا۔ ہم تینوں گھاس میں بیٹھے بیٹھے آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔ یہ مرحلہ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ذرا سی غلطی اور غفلت ہمیں گولیوں کا نشانہ بنا سکتی تھی ہم کیمپ اور سرچ لائٹوں کی روشنی سے نکل کر اس جگہ پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاں اندھیرا شروع ہوتا تھا۔ مگر یہ طویل فاصلہ نظر آتا تھا۔ گھاس میں رینگنے سے گھاس ہلتی اور شک پیدا کر سکتی تھی۔

رینگنے کی ترتیب یہ رکھی کہ آگے میجر نادر پرویز تھے۔ ان کی ذمہ داری تھی کہ سامنے کوئی خطرہ ہو تو وہ اشارہ کر کے ہمیں خبردار کریں۔ دائیں اور بائیں دیکھنے کی ذمہ داری میجر طارق پرویز کی تھی اور پیچھے کے خطروں کا خیال رکھنا اور ان دونوں کو خبردار کرنا میرا فرض تھا۔ ہم ایک دوسرے سے اتنی ہی دور تھے کہ ایک دوسرے کو

چھو سکتے تھے۔ ہم ہاتھوں سے باتیں اور اشارے کرتے تھے۔ زبان سے کچھ نہیں بولنا تھا۔ ہم نہایت ہی آہستہ گھاس میں رینگتے سرکتے گئے۔ کیمپ اور اس جہنم کی روشنیاں پیچھے ہٹ رہی تھیں، مگر رفتار بہت ہی کم تھی۔ ہوا ہمیں سکون دے رہی تھی۔ کیمپ میں بھی یہی ہوا جاتی تھی، لیکن کیمپ سے باہر اس کا تاثر ہی کچھ اور تھا۔ آزادی اور اسیری کی ہوا میں بھی آگ اور پانی جتنا فرق ہوتا ہے۔

ہم رینگتے رینگتے ستر اسی گز دور نکل گئے اور گھاس ختم ہو گئی اور سامنے کھلا میدان آگیا۔ اس کے بعد چاند ماری کا بٹ تھا۔ وہاں تک سرچ لائٹوں کی روشنی خاصی مدہم ہو گئی تھی۔ ہم اٹھ کر چلنے لگے۔ میدان میں رینگنا شک پیدا کر سکتا تھا۔ چلتے چلتے ہم اس جگہ پہنچ گئے جسے ہم فوجی زبان میں چاند ماری کا فائرنگ پوائنٹ کہتے ہیں۔ وہاں مکمل اندھیرا نہیں تھا کیونکہ رات چاندنی تھی۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ بائیں طرف کچھ دور بڑی سڑک تھی جس پر فوجی گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ ہمارے قریب جھاڑیاں تھیں۔ ان میں چھپ کر ہم نے قیدی کیمپ والے کپڑے اتار پھینکے اور وہ کپڑے پہن لئے جن پر قیدی کیمپ کا کوئی نشان نہیں تھا۔

کیمپ سے باہر ملاقات
ایک مسلمان لڑکے سے

میں نے پیچھے بتایا ہے کہ ہمیں شناختی کارڈ بنوانے کا حکم ملا تھا جس پر ہمارے فوٹو بھی چھپاں تھے۔ ہم نے فرار کے ارادے کے پیشِ نظر ان کارڈوں کے لئے اپنے حلیئے اس طرح بگاڑنے شروع کر دیئے تھے کہ داڑھیاں بڑھا لیں اور جن کی مونچھیں تھیں، انہوں نے مونچھیں رکھ کر انہیں گھنا کر لیا تھا۔ اسی حلیئے میں ہمارے فوٹو لئے گئے تھے۔ اب کیمپ سے نکلے تو اس بہروپ کو اتارنا ضروری

تھا۔ اس کے لئے ہم حجام کی بال کاٹنے والی مشین چرا لائے تھے۔ ہم نے اس مشین سے داڑھیاں صاف کیں۔ کپڑے جو اتارے تھے وہ قریب ہی ایک گندے نالے میں پھینک دیئے۔ ہمیں یہ نالہ پار کرنا تھا۔ بہت دور نکل گئے مگر کوئی پُل نظر نہ آیا۔

پھر ہمیں جو پُل نظر آیا وہ کیمپ کے مین گیٹ کے ساتھ والے واچ ٹاور کے ساتھ تھا۔ وہاں سے نالہ پار کرنا بے حد خطرناک تھا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ نالے میں سے گذرنا شک پیدا کرتا تھا۔ ہم نے اللہ کا نام لیا اور نالہ پار کر گئے۔ ہم سڑک پر نہ گئے۔ چلتے چلتے ہم جوانوں کی بارکوں کے قریب سے گذرنے لگے۔ اور پھر ایک سڑک پر آگئے جس کے متعلق ہمارا خیال تھا کہ ریلوے سٹیشن کی طرف جاتی ہے۔ چونکہ یہ چھاؤنی کا علاقہ تھا اور وہاں قیدی کیمپ بھی تھا اس لئے ہمیں کئی جگہ سنتری نظر آئے۔ ہم خود اعتمادی سے چل رہے تھے۔ چال مشکوک نہیں تھی۔ کسی ایک سنتری نے بھی ہمیں نہ روکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رات کے ابھی آٹھ بجے تھے۔

آگے ریلوے کا پھاٹک آگیا۔ اس سے ریلوے لائن عبور کی تو آگے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک راہ جاتے آدمی سے ریلوے سٹیشن کا راستہ پوچھا تو اس نے بتا دیا۔ ہم نے یہ ارادہ کیا تھا کہ ریلوے سٹیشن جا کر وہاں سے سائیکل رکشا لیں گے اور اس پر فرخ آباد جائیں گے۔ فتح گڑھ سے ہم گاڑی پر سوار نہیں ہونا چاہتے تھے کیونکہ خطرہ تھا کہ کیمپ کا کوئی افسر یا کوئی اور ایسا ہندوستانی مل جائے گا جو ہمیں پہچان لے گا۔ وہاں تک جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ راستے میں ہی ایک سائیکل رکشا مل گیا۔ ہمارے پاس ہندوستانی کرنسی تھی۔ اسے فرخ آباد چلنے کو کہا لیکن اس نے تین آدمیوں کو بٹھانے سے انکار کر دیا۔ ہم پیسے بچانا چاہتے تھے مگر رکشا والے کو زیادہ پیسے پیش کرنے پڑے۔ وہ مان گیا۔

رکشا والا سولہ سال کی عمر کا مسلمان لڑکا تھا۔ اس نے رکشا چلایا تو اس کی
زبان بھی چل پڑی۔ اس نے کچھ اس طرح کی کہانی سنانی شروع کردی کہ اسکے باپ کے پاس
چار گھوڑے ہوا کرتے تھے مگر اب وہ رکشا چلانے پر مجبور ہے۔ اس کی صرف
ماں ہی ماں ہے۔ بارہ گھنٹوں کی مشقت سے بمشکل پیٹ بھرتا ہے۔ ہم نے اسے
بتایا کہ ہم بھی مسلمان ہیں تو وہ اور کھل کر باتیں کرنے لگا۔ اس نے یہاں تک کہا کہ
ہندو کچھ خود غرض مسلمانوں کو ساتھ ملا کر ہندوستان کے مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی
کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اس سے ہندوستان کی حکومت کے متعلق رائے پوچھی۔
اس نے کہا کہ جناب اب وہ باتیں کہاں جو سنتے ہیں کہ خان لوگوں کے دور میں تھیں۔
اب تو حکومت پنڈتوں کے ہاتھ آگئی ہے۔ یہ بنئے کہاں حکومت کے قابل تھے۔

ہم نے باتوں باتوں میں اس سے اپنے کام کی بہت سی معلومات لے لیں فرخ
آباد پہنچے۔ منہ ہاتھ دھونے کی ضرورت تھی۔ ارادہ تھا کہ منہ ہاتھ دھو کر سٹیشن پر جائینگے
اور گاڑی سے لکھنؤ چلے جائیں گے۔ ایک نل نظر آگیا۔ سائیکل رکشا رکوایا۔ نل پر منہ ہاتھ
دھو کر تولئے سے خشک کیا اور کنگھی کی۔ پھر رکشا پر بیٹھے اور اُسے کہا۔ "کسی ایسی جگہ
لے چلو جہاں پینے کو کچھ مل جائے۔"

وہ کچھ دیر چل کر رک گیا اور ایک طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہاں چلے جائیں۔
ہم اتر کر اُدھر گئے اور جب عمارت کے اندر داخل ہوئے تو شراب کی بدبو نے
ہمیں روک لیا۔ یہ شراب خانہ تھا۔ واپس آکر رکشا والے سے کہا کہ ہم مسلمان ہیں،
اور تم نے ہمیں شراب خانے میں بھیج دیا تھا۔ وہ بے چارہ "کچھ پینے" کو شراب سمجھا تھا۔
بہت شرمسار ہوا اور ہم سے معافی مانگی۔ ہم نے اسے کہا کہ ہم کوئی ٹھنڈی چیز پینا
چاہتے ہیں۔ وہ رکشا ایک گلی میں لے گیا اور چھوٹے سے ایک ہوٹل کے سامنے رُکا۔
ہمارے کہنے پر وہ ہوٹل سے تین بوتلیں لے آیا۔ میں نے اسے پیسے دے کر کہا کہ
اپنے لئے اور میرے لئے پان لے آئے وہ ہمارے ساتھ خلوص سے تعاون
کر رہا تھا۔ نادر اور طارق نے کبھی پان نہیں کھایا تھا۔

اس نے ہمیں فرخ آباد ریلوے سٹیشن تک پہنچا دیا۔ اچھا خاصا سٹیشن ہے
معلومات کی کھڑکی سے معلوم کیا کہ لکھنؤ جانے والی گاڑی کتنے بجے جاتی ہے۔ بتایا
گیا بارہ بجے آئے گی۔ ابھی ساڑھے نو بجے تھے۔ اتنا انتظار محال تھا اور خطرناک
بھی۔ ہم پلیٹ فارم پر ایک اندھیری جگہ جا بیٹھے۔ "واچ اینڈ وارڈ" کا ایک سنتری
آگیا اور ہم سے پوچھا کہ ہم یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ ہم نے جواب دیا کہ گاڑی کے انتظار
میں بیٹھے ہیں۔ وہ چلا گیا۔ ہماری ذہنی کیفیت میں بے چینی تھی۔ ہر آدمی ہمیں سنتری
معلوم ہوتا تھا۔ کہیں سے ذرا سی بھی آواز اور آہٹ سنائی دیتی تو ہم چونک اٹھتے
جیسے کوئی ہمارے تعاقب میں آرہا ہو۔ ہم دل ہی دل میں خدا سے التجا کر رہے تھے
کہ کیمپ میں ابھی ہمارے فرار کا پتہ ہندوستانیوں کو نہ چلا ہو۔

پہلے ہی سٹیشن پر مایوسی

گیارہ بج گئے تو ہم نے ٹکٹ خریدنے کا فیصلہ کیا۔ میں ٹکٹ لینے گیا۔ لکھنؤ
کے تین ٹکٹ مانگے۔ میں نے سو روپے کا نوٹ دیا تو بکنگ کلرک نے نوٹ
کو غور سے دیکھ کر مجھے واپس دے دیا۔ کہنے لگا کہ یہ پانی سے خراب ہوگیا ہے۔
اسے دوسرے نوٹ دکھائے۔ سب ایسے ہی تھے۔ ہوا یہ تھا کہ میں نے یہ
ہندوستانی نوٹ مومی کاغذ میں لپیٹ کر کیمپ میں زمین میں دبا دیئے تھے۔ بارشوں
کا پانی اندر رجتا رہا جس سے نوٹ خراب ہوگئے تھے۔ میں نے بکنگ کلرک کی منت
سماجت کی اور کہا کہ مجھے بہر حال لکھنؤ جانا ہے، مگر اس نے یہ نوٹ قبول کرنے
سے معذوری کا اظہار کیا۔ یہ اب بہت ہی تکلیف دہ مسئلہ تھا۔ میں نے سٹیشن پر
گھومتے پھرتے متعدد آدمیوں سے نوٹ کے کھلے پیسے مانگے مگر کسی نے بھی ٹوٹے
پیسے نہ دیئے۔

باہر کی دنیا کے اس پہلے مسئلے نے دل پر بڑی زبردست ضرب لگائی لیکن میں

نے حوصلے اور استقلال کو اتنی جلدی مجروح نہ ہونے دیا۔ انسان گھبرا نہ جائے، اوسان خطا نہ ہونے دے تو عقل رہبری کرتی ہے۔ میرے دماغ نے ایک راستہ دکھا دیا۔ یہ راستہ کسی ایسی دکان کو جاتا تھا جو رات گیارہ بجے کھلی ہوئی مل جائے۔ اور میں اس سے کچھ خریدوں اور اسے سو روپے کا یہ ہندوستانی نوٹ دوں۔ میں اس راستے پر چل پڑا۔ ریلوے سٹیشن سے نکلا سامنے مٹھائی کی ایک دکان نظر آئی۔ میں اسی کی طرف چل پڑا۔

ادھیڑ عمر کا ایک لالہ دکان پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے نمستے کہہ کر کہا: "آدھا سیر مٹھائی دے دیں۔"

لالہ جی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کے ماتھے پر شکن دیکھ کر میں چونکا۔ یہ شکن بے معنی نہیں تھے۔ کیا میرے چہرے پر لکھا تھا کہ میں مفرور جنگی قیدی ہوں؟ اس نے کہا۔ "ارے صاحب! سیروں کو ہندوستان سے دیس نکالا ملے مدت ہو گئی ہے۔ آپ ابھی تک انہیں سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہندوستان میں سیر نہیں کلو چلتے ہیں۔ لوگ سیروں چھٹانکوں کو بھول چکے ہیں۔ میں نے بات بنائی اور کہا: "لالہ جی! نئی چیز تو سب کو پیاری لگتی ہے۔ مگر عظمت اس میں ہے کہ آپ پرانی چیزوں کو دل سے اتار نہ دیں، کبھی کبھی انہیں یاد کر لیا کریں۔"

کچھ ایسی ہی باتوں باتوں میں مَیں نے سو روپے کا نوٹ اسے دے دیا۔ اس نے نوٹ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ نوٹ قبول کرنے کے موڈ میں نہیں لگتا تھا۔ میں نے کہا: "پانی سے کچھ خراب ہو گیا ہے۔ آپ تو اسے کل بینک میں جمع کرا سکتے ہیں۔ میں اس گاڑی سے جا رہا ہوں۔"

اس نے نوٹ لے لیا اور نصف کلو مٹھائی تول کر دے دی۔ آپ میری اس وقت کی مسرتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میرا خراب نوٹ بھی ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ آدھا سیر معاف کیجیے گا۔ آدھا کلو مٹھائی بھی مل گئی۔ میں مٹھائی

اور باقی پیسے لے کر فاتحانہ چال چلتا بکنگ کلرک کے پاس گیا۔ لکھنؤ کے تین ٹکٹ خریدے اور اپنے ساتھیوں کے پاس گیا۔ میں اس قدر خوش تھا کہ اگر اپنے اوپر قابو نہ پا لیتا تو مٹھائی بکنگ کلرک کو دے آتا۔ مجھے یہ بھی یاد آ گیا تھا کہ ہم نے کچھ کھایا نہیں تھا، مگر مٹھائی کھانے لگے تو معلوم ہوا کہ ہم نہیں کھا سکیں گے۔ طبیعت پر جو ہیجان طاری تھا اس نے بھوک مار دی تھی۔

جہاں سے بھاگے
وہیں جا پہنچے

یوں معلوم ہوا جیسے وقت کی رفتار بہت کم ہو گئی ہے۔ پونے بارہ بجے تک معلوم ہوا کہ گاڑی کی رفتار بھی کم ہے اور آدھا گھنٹہ لیٹ آ رہی ہے۔ اس اطلاع نے ہمیں پریشان کر دیا۔ وہاں تو ایک ایک منٹ قیمتی تھا، اور کہاں پورے تیس منٹ تباہ ہو گئے۔ آخر ساڑھے بارہ بجے گاڑی کے انجن کی روشنی نظر آئی۔ تیس روزے رکھ کر عید کے چاند کی اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی ہمیں گاڑی کی روشنی دیکھ کر ہوئی۔ گاڑی پلیٹ فارم تک آئی اور رکی۔ ہمارے دل اور زور سے دھڑکے۔ خدائے ذوالجلال سے مدد اور حفاظت کی دعا کی اور ایک ڈبے میں چڑھ گئے۔ رش تو نہیں تھا لیکن بعض مسافروں نے لیٹ کر سیٹوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ کچھ مسافر کھڑے تھے ہم بھی کھڑے ہو گئے اور انجن نے روانگی کی وسل دی۔ میری کیفیت یہ ہو رہی تھی کہ جی میں آتی تھی کہ نیچے اتر کر گاڑی کو اتنی زور سے دھکا لگاؤں کہ فوراً ہی ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

گاڑی چلی اور فرخ آباد کے ریلوے سٹیشن سے نکل گئی۔ شہر کی بتیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو میں نے سکون کی آہ لی مگر گاڑی نے اگلے سٹیشن پر رک کر سکون تباہ و برباد کر دیا۔ یہ سٹیشن فتح گڑھ تھا جہاں سے ہم فرار ہوئے تھے، اور جہاں سے ہم اس لئے گاڑی پر سوار نہیں ہونا چاہتے تھے کہ پکڑے جائیں گے۔ ہم دوسرے سٹیشن سے جا کر سوار ہوئے تو گاڑی ہمیں فتح گڑھ لے آئی۔ ہر لمحہ یہ توقع تھی کہ ملٹری پولیس

ڈبوں کی تلاشی یقینی ہمارے ڈبے میں بھی آئے گی، اور ہم پھر اپنے کیمپ میں پہنچا دیئے جائینگے۔ ہم محتاط اور ہوشیار ہو گئے۔ نظریں دروازوں اور کھڑکیوں پر لگا دیں۔

پانچ منٹ پانچ دنوں کی رفتار سے گذرے اور گاڑی خیریت سے چل پڑی، مگر تھوڑا سا چل کر رُک گئی۔ اب خیریت نہیں تھی۔ گاڑی کا یوں رُکنا بے معنی اور بے مقصد نہیں تھا۔ اب ہم ملٹری پولیس اور دیگر فوجیوں کی راہ دیکھنے لگے۔ ہمیں فرار ہوئے ساڑھے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ہندوستانیوں کو ہمارے فرار کا کھوج مل گیا ہو۔ ہم تینوں دوسری طرف کے دروازے کے ساتھ ہو گئے کہ چیکنگ والے جونہی اندر آئیں ہم اُس دروازے سے نکل جائیں۔ میرا دل اتنی زور سے اچھلتا تھا کہ بہت زیادہ کوشش سے اسے حلق سے نیچے اپنی جگہ تک دھکیلنا پڑتا تھا۔

باہر کوئی بڑبڑاتا اور کوستا جا رہا تھا جس سے اندازہ ہُوا کہ انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے بھی دل میں انجن کو بُرا بھلا کہا۔ اسے اپنے اندر خرابی پیدا کرنے کے لئے کوئی اور دن منتخب کرنا چاہیئے تھا۔ گھڑی دیکھ دیکھ کر شک ہوتا تھا کہ انجن کے ساتھ ہی گھڑی بھی رک گئی ہے۔ ہمیں پورے چالیس منٹ بے یقینی اور خدشات میں گذارنے پڑے۔ انجن نے وسل دی اور گاڑی نے حرکت کی۔ اس وقت تک ہمارے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ پاکستان کا فوجی دس دن مسلسل کچھ کھائے پئے بغیر لڑ سکتا ہے مگر اس کے لئے دس منٹ کی بے یقینی میں انتظار محال ہوتا ہے۔ ہم نے چالیس منٹ یوں گذارے جیسے ہمارے اوپر سے ایک پہاڑ آہستہ آہستہ گذرا ہو۔ گاڑی چلی اور فتح گڑھ پیچھے رہ گیا۔

ہم چند ایک مسافروں کے ساتھ ابھی تک ڈبے میں کھڑے تھے جب کہ چند ایک مسافروں نے لیٹ کر سیٹوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ان میں اتنی مروت نہیں تھی کہ ذرا سمٹ کر بیٹھیں اور دوسروں کو جگہ دیں۔ میجر نادر پرویز سے نہ رہا گیا۔ ایک سیٹ پر ایک موٹا بھدا لالہ لیٹا ہُوا تھا۔ میجر نادر نے اسے شرافت سے کہا کہ ذرا پاؤں سمیٹ لے۔

اس ہندو بنیئے نے پاؤں سمٹنے کی بجائے میجر نادر کو گھورنا شروع کر دیا۔ میجر نادر بھول گیا کہ وہ مفرور جنگی قیدی ہے۔ اس نے ہاتھ لمبا کر کے لالے کی ٹانگیں پرے دھکیل دیں۔ اور بیٹھ گیا۔ لالے نے کہا: "طاقت آزمائی کا ارادہ ہے؟" ہم جانتے تھے یہ لالے کی گیدڑ بھبھکی ہے۔ میجر نادر نے چیلنج قبول کر لیا اور طاقت آزمائی کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ خاموش رہو۔ ہماری پوزیشن بہت نازک تھی۔ جھگڑا بڑھ سکتا تھا ہم تو ان ہندوؤں سے جلے بیٹھے تھے۔ غصے اور انتقام سے بے قابو ہو کر ہم اس لالے کی بہت بُری حالت کر سکتے تھے، لیکن پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔

رات گاڑی میں گذر گئی اور صبح کے اجالے میں کانپور پہنچی۔ قدرت نے ہمارے اوپر سے رات کی تاریکی کا پردہ اٹھا لیا تھا۔ اب بہت ہی زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہم نے کانپور پہنچنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کیا تھا کہ لکھنؤ اتر جائیں یا کانپور اتر کر دلی کی گاڑی پکڑیں۔ گاڑی کو لکھنؤ صبح آٹھ بجے پہنچنا تھا۔ لکھنؤ جانے میں یہ خطرہ تھا کہ وہاں جنگی قیدیوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہم جانتے تھے کہ صبح گنتی کے وقت ہمارا فرار بے نقاب ہو جائے گا۔ اس کی فوری اطلاع لکھنؤ ہیڈ کوارٹر کو دی جائے گی۔ ہیڈ کوارٹر فوری تلاش کا حکم دے گا۔ ہم نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ہو سکتا ہے ہمارے لکھنؤ پہنچنے سے پہلے ہمارے فرار کی اطلاع پہنچ چکی ہو۔ رات کو فتح گڑھ سے گذرنے والی یہی ایک گاڑی تھی۔ اسے روک کر اس کی تلاشی لی جا سکتی تھی۔ ہم ہلکا سا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہیں تھے۔

کانپور ——— بچہ بچہ دشمن

ہم اس ارادے سے کانپور اُتر گئے کہ یہیں سے دلی کو روانہ ہو جائیں گے۔ کانپور ہندوستان کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے اور یہ ہندوستان کا پہلا بڑا شہر تھا۔ جس سے ہمارا گذر ہُوا۔ یہ صنعتی شہر ہے۔ ہم نے گذشتہ روز اپنی داڑھیاں مشین سے

صاف کی تھیں۔ ایک دوسرے کے چہرے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ ہماری داڑھیوں کی موجودہ شکل کیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی اناڑی نے گھاس کاٹی ہو۔ ریلوے سٹیشن سے نکلے۔ ایک مسلمان حجام کی دکان نظر آ گئی۔ وہاں جا کر سلیقے سے شیو کرائی، پھر ہم ایک ہوٹل میں چلے گئے۔

ایک مدت بعد اچھا ناشتہ کیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قیدی کیمپ کے نَو مہینوں نے ہماری ذائقے کی حس مردہ کر دی ہے۔ کیمپ کے ادھ پکے اور گھٹیا کھانے کھا کھا کر ہم اچھے بُرے ذائقے اور ذوق سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ ہوٹل کے ناشتے نے جسموں میں تازگی پیدا کر دی، اور پھر ریلوے سٹیشن کے اندر چلے گئے۔ ہم دشمن کے پیٹ میں گھوم پھر رہے تھے۔ اس کا بچہ بچہ اور ذرہ ذرہ ہمارا دشمن تھا۔ ذرا سے شک پر کوئی ہمیں روک لیتا تو ہمیں چھڑانے والا یا کسی بھی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔

سٹیشن کے بک سٹال سے ہم نے ریلوے ٹائم ٹیبل خریدا، جس نے بعد میں ہماری خوب رہبری کی۔ دِلّی کے لئے ایک گاڑی ساڑھے سات بجے روانہ ہوتی تھی ہم نے ٹکٹ لئے اور گاڑی کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے، لیکن ہم اکٹھے نہیں بیٹھے ایک دوسرے سے دُور دور بیٹھے۔ ہم نے طے یہ کیا تھا کہ سفر کے دوران اس انداز سے اکٹھے ہونگے جیسے ہم ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے پہچانتے تھے اور گاڑی میں اچانک یا اتفاقیہ ملاقات ہو گئی ہو۔ اس کے علاوہ ہم نے اپنے نام بھی رکھ لئے تھے۔ سفر کے دوران ہمیں ایک دوسرے کو انہی نئے ناموں سے پکارنا تھا۔ میں رحیم بن گیا، میجر طارق کا نام سلیم اور میجر نادر کا نسیم رکھا گیا۔

میرے سامنے والی سیٹ پر دو ہندو عورتیں بیٹھی سندھی زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں سندھی نہیں ہوں، لیکن وہیں جنا پلا ہوں۔ اس لئے سندھی روانی سے بول سکتا ہوں۔ میرا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے سندھ میں آباد ہوا تھا۔ میں نے ان عورتوں کے ساتھ سندھی میں باتیں شروع کر دیں۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ گاڑی چلی جا رہی تھی۔ فتح گڑھ دور پیچھے رہ گیا تھا، مگر کبھی یوں دل پر گھبراہٹ سی چھا جاتی

جیسے فتح گڑھ کا کیمپ اپنی خاردار تاروں اور واچ ٹاوروں سمیت میرے تعاقب میں آ رہا ہو۔ میں نے ایسی گھبراہٹ کو سندھی زبان میں ان عورتوں کے ساتھ گپ شپ میں ڈبو دیا، اور دوپہر کا وقت آ گیا۔ اب بھوک کا احساس ہونے لگا، مگر یہ میرے لئے یا کسی بھی فوجی کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم فوجی لوگ نیند اور بھوک سے کبھی مغلوب نہیں ہوئے۔

اتنے میں ان ہندو عورتوں نے ایک برتن کھولا اور اس میں سے گھر کی روٹیاں اور سالن نکالا۔ انہوں نے مجھے کھانے کی دعوت دے کر پریشان کر دیا۔ پریشانی یہ تھی کہ روٹیاں اور سالن دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے اُوپر فوجیت طاری کی اور ان کو بصد شکریہ ٹال دیا۔ تین بج رہے تھے۔ جب ایک سٹیشن سے ہم نے ایک روپے کی پوڑیاں اور چار آنے کی ترکاری لی۔ اس وقت تک ہم تینوں اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک پوڑی کے دو نوالے بنتے تھے۔ ترکاری کسی درخت کے پتے میں تھی۔ ہمیں یہ سوچ کر کہ نہ جانے کتنا عرصہ ہندوستان میں ہی گھومنا پھرنا پڑے کنجوسی سے بڑھ کر کفایت شعاری کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے جو ترکاری لی تھی وہ ختم ہو گئی، پوریاں بچ گئیں۔ بچنے سے مراد یہ نہیں کہ ہمارے پیٹ بھر گئے تھے بلکہ یہ کہ ترکاری اتنی تھوڑی تھی کہ پوڑیوں کا ساتھ نہ دے سکی۔ ہم نے مزید دو آنے کی ترکاری لی اور پوریاں ختم ہو گئیں۔ اس کھانے سے ہماری بھوک مطمئن نہیں ہوئی صرف سہارا مل گیا۔ ہم نے کھانے کا وقت تین بجے اس لئے مقرر کیا تھا کہ رات کا کھانا نہیں کھائیں گے۔

آگرہ سے دِلّی —— آگے راستے بند

مسافروں کی باتوں سے معلوم ہُوا کہ آگرہ آنے والا ہے اور گاڑی تاج محل کے قریب سے گذرے گی۔ ہم تینوں ساتھیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہم تینوں پر تاج محل کے تصور نے جذبات کا غلبہ طاری کر دیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آگرہ کتنی دور رہ گیا ہے۔ میں نے تاج محل دیکھنے کے لئے پہلے ہی سر کھڑکی سے

نکال لیا اور میری نظریں افق کو کھوجنے لگیں جہاں سے تاج محل کو اُبھرنا تھا۔ بیتابانہ انتظار کے بعد دور سپید سپید مینار اور ایک گنبد نظر آنے لگا۔ وہ تھا تاج محل جو گاڑی کی رفتار سے قریب آ رہا تھا۔ پھر ہندوستان پر مسلمانوں کے دورِ حکومت کی یہ عظیم یادگار اپنی پوری آب و تاب اور عظمت کے ساتھ ہمارے قریب آ گئی۔ نظریں سیر نہیں ہو رہی تھیں۔

تاج محل دیکھ کر وہ دورِ حکومت یاد آ گیا جب ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی، اور ہندو ان کی جوتیاں چاٹتے تھے۔ آج اسی سرزمین پر ان مسلمانوں کی سپاہ ہندو کی قید میں تھی، اور ہم تین سپاہی اس طرح اس زمین پر چلے جا رہے تھے کہ کوئی پکڑ نہ لے۔ عالمی قواعد و ضوابط کی نظر میں ہمارا فرار کوئی جرم نہیں تھا، لیکن ہندو کی نگاہ میں ہم مجرم تھے۔ ہمیں اسیر اور مجرم اپنوں نے بنایا تھا، قوم کے غداروں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو شرمسار کیا تھا۔ انہوں نے مل جل کر اس فوج کو قید کرایا جس کی عسکری اہلیت اور شجاعت کو دشمن اور غیروں نے بھی خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

دل ڈوبتا گیا اور تاج محل گذرتا گیا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گاڑی آگرہ کے قلعے کے قریب سے گذری۔ میں نے فوجی نظروں سے اس کی اُس دور کی افادیت اور مضبوطی کا جائزہ لیا۔ قلعہ تو آج بھی مضبوط نظر آ رہا تھا مگر اس کی بنیادیں کھوکھلی لگتی تھیں...... ساڑھے تین بجے گاڑی آگرہ ریلوے سٹیشن پر رکی۔ ہم تینوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ میرا ایک ساتھی کہتا تھا کہ آگرہ میں ہی اتر جائیں۔ دوسرے نے زور دیکر کہا ہمیں ہر حال میں دلی کی بجائے دلی کے کسی مضافاتی سٹیشن پر اترنا چاہیئے۔ ٹائم ٹیبل دیکھا۔ دلی کے نزدیک نظام الدین اولیاء کا چھوٹا سا سٹیشن نظر آیا جو اتنا چھوٹا ہے کہ اسے "ہالٹ" کہتے ہیں۔

شام کے چھ بج رہے تھے جب گاڑی دلی کی حدود میں داخل ہو کر نظام الدین اولیاء ہالٹ پر رکی۔ ہم اُترے اور مزار کی طرف چل دیئے۔ مزار کے قریب سے گذر کر چھوٹے سے ایک بازار میں داخل ہوئے۔ وہاں ہمیں "سندھ پنجاب ہوٹل" نظر آیا۔ اسی

میں چلے گئے۔ پیسوں کی کمی بُری طرح کھٹکنے لگی تھی۔ ہوٹل میں کم سے کم پیسوں سے چائے وغیرہ منگوائی اور ہندوستان سے نکلنے کے راستوں پر غور کرنے لگے۔ ایک راستہ نیپال کا تھا مگر اسے اس وجہ سے نظر انداز کیا کہ یہ ایک آسان راستہ تھا جس سے ہندوستانی بھی واقف تھے، اس لئے خدشہ تھا کہ وہاں ہندوستانی ہماری تلاش میں سرگرم ہونگے۔ دوسرا راستہ کشمیر کا تھا۔ اُدھر سے پنجاب میں داخل ہونے پر غور کیا مگر اس علاقے میں راہنمائی کے بغیر جانا خودکشی کے برابر تھا۔

تیسرا راستہ ہندوستان اور پاکستان کی پنجاب والی سرحد تھی۔ اسے عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ دونوں طرف فوجیں مورچہ بند تھیں۔ فوجوں کو سرحد پر ایسے طریقے سے مورچہ بند کیا جاتا ہے کہ کہیں شگاف نہیں رہتا اگر کہیں شگاف رہ بھی جائے تو وہ گشتی پارٹیوں سے پُر کر لیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے پنجاب کی سرحد کو بھی ذہن سے اتار دیا اور چوتھے راستے کو زیرِ بحث لائے۔ یہ تھار اجستھان کا وسیع و عریض ریگستان۔ وہاں مورچہ بندی میں ہمیں شگاف مل سکتے تھے مگر تجربے، راہنمائی اور پانی کے بغیر ریگستان کا سفر کرنا خودکشی کی ایک اذیت ناک اور کامیاب کوشش ہوتی ہے۔

آخر میں بمبئی کی بندرگاہ اور سمندر پر غور کیا گیا۔ یہی راستہ موزوں اور دوسروں کی نسبت آسان تھا۔ ہم نے اس پر غور کیا کہ بمبئی جا کر غیر ملکی بحری جہاز سے کراچی چلے جائیں، مگر سب سے بڑی دشواری یہ سامنے آئی کہ اتنے لمبے سفر کے لئے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے۔ دلی سے بمبئی تک چھتیس گھنٹوں کا سفر تھا۔ اس سے آپ تین آدمیوں کے کرائے کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ آسان اور محفوظ راہِ فرار پیسوں کی وجہ سے مسدود نظر آئی۔ پھر بھی ہم وہاں بیٹھے تو نہیں رہ سکتے تھے۔ مجھے اپنی برادری یاد آئی جو ابھی تک ہندوستان میں ہے۔ ان سے مدد مانگنے کی سوچی مگر میں برادری میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ ان کے علاقے کے متعلق کچھ معلومات تھیں۔ میں اُن لوگوں کی اور اُن کے علاقے کی نشاندہی نہیں کروں گا۔

نادر اور طارق نے فیصلہ کیا کہ وہ دونوں دلی میں ٹھہریں گے اور میں اکیلا اپنی برادری کی تلاش میں جاؤں۔ وہ علاقہ بہت دور تھا۔ اس فیصلے کے تحت ہم دلی ریلوے سٹیشن کی

طرف چل پڑے۔ وہاں سے گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ سٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں سے اپنی منزل کے سٹیشن کی طرف جانے والی گاڑی کے متعلق معلوم کیا تو پتہ چلا کہ گاڑی ساڑھے آٹھ بجے جائے گی۔ گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ہم دلی سٹیشن کے سامنے والے پارک میں وقت گذارنے کے لئے چلے گئے۔ اس پارک کے اردگرد چھوٹی سی دیوار ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے سِلا ہوا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سیدھے راستے سے جانے کی بجائے میں دیوار پھلانگنے لگا تو میرے ہاتھ کے لگے ہوئے پاجامے کے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ سلائی اُدھڑ گئی۔ نارمل حالات میں پاجامے کا یوں اُدھڑ جانا دلچسپی اور تفریح کا باعث بنتا مگر فرار کی حالت میں یہ عظیم نقصان ثابت ہوا۔

ہم فوجی تھے۔ ایسی ضروریات کا سامان ہر وقت ساتھ رکھنے کے عادی تھے۔ سوئی دھاگہ پاس تھا۔ میں نے پاجامے کی مرمت شروع کر دی جو اُن لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنی جو ہمارے قریب سے گذرتے ہمیں دیکھتے تھے۔

غیبی مدد

ہم سوا آٹھ بجے پارک سے اٹھے۔ میں نے اپنی منزل کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں جا سوار ہوا۔ گاڑی چلی تو نادر اور طارق نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ میں انہیں دیکھتا رہا، حتیٰ کہ ہم ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ایک سوال نے مجھے پریشان کر دیا۔ کیا ہم دوبارہ مل سکیں گے؟ — خدائے ذوالجلال کی ذاتِ باری کے سوا اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے اپنے ان دوستوں سے کم از کم دو دن دور رہنا تھا۔ زیادہ دن بھی لگ سکتے تھے اور کوئی اَن ہونی بھی ہو سکتی تھی۔ میں اب تنہا تھا۔ خدا سے مدد کی التجا کی اور اس ڈبے کا جائزہ لیا جس میں مَیں سوار ہوا تھا۔ یہ تھرڈ کا ڈبہ تھا اور گاڑی پسنجر ٹرین تھی۔ غلیظ بھی۔ بیٹھنے کو جگہ نہیں تھی۔ میرے قریب والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر مارواڑی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ زبان راجستھان کے جودھپور، جے پور، بیکانیر اور جیسلمیر

کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ دلی میں بھی یہ زبان کہیں کہیں سننے میں آتی ہے۔ آپ کیلئے یہ اطلاع شاید دلچسپ ہو کہ مارواڑی میری مادری زبان ہے۔ میں سیٹ پر بیٹھے ہمسفروں سے مارواڑی میں باتیں کرنے لگا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ انہوں نے مجھے بیٹھنے کو جگہ دے دی۔

رات بھر کے سفر کے بعد میں منزل پر پہنچ گیا۔ صبح کے سات بج رہے تھے جب میں ریلوے سٹیشن پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اپنی برادری کے لوگوں تک کیسے پہنچوں۔ مجھے ان کے ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔ پاکستان میں اپنے بزرگوں نے ان کے متعلق جو کچھ بتایا تھا وہ اسی علاقے کی نشاندہی کرتا تھا۔

میں اسے ایک معجزہ اور اللہ کی خصوصی کرم نوازی کہوں گا کہ ایک قلی سے اپنی برادری کے لوگوں کے اور عزیزوں کے متعلق پوچھا تو اس نے وثوق سے بتایا کہ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں۔ میں وہاں چلا گیا۔ میں سوچ یہ رہا تھا کہ بات کس سے کروں اور کیسے کروں۔ یہاں لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے۔ میں نے کسی بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ بات کرنا مناسب سمجھا۔ ایک معمر آدمی نظر آ گیا۔ اسے جا کر سلام اور مصافحہ کر کے کہا کہ وہ میری بات ذرا اطمینان سے سنیں۔ میں نے اپنے والد صاحب کا حوالہ دیا۔ یہ بزرگ انسان میرے والد صاحب کو جاننے والوں میں سے نکلے۔ ان کا نام سنتے ہی انہوں نے ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔

میں نے انہیں بتا دیا کہ میں ان کی خدمت میں کیوں حاضر ہوا ہوں اور کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ انہوں نے گہری دلچسپی سے میری روئیداد سنی۔ انکے انداز سے مجھے یقین ہو گیا کہ میں غلط ہاتھوں میں نہیں پھنس گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ جذباتیت کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہ بچوں کی طرح رونے لگے — یہ ایک مسلمان کے آنسو نہیں تھے، یہ ہندوستان کے ہر ایک مسلمان کا گریہ تھا، بلکہ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی آہ و زاری تھی۔ عالمِ اسلام کی بدبختیوں پر کوئی جتنا بھی روئے کم ہے۔

انہوں نے وہ سارا دن مجھے اپنے پاس رکھا۔ رات بھی رکھا۔ اور گلہ کیا کہ میں اپنے دو دوستوں کو دلّی چھوڑ آیا ہوں۔ اس پہ وہ افسوس کر رہے تھے۔ میں نے انہیں اپنی مجبوری بتائی۔ رات گئے تک وہ میری سنتے اور اپنی سناتے رہے۔ میرے پاجامے کو انہوں نے مشین سے سلوا دیا۔ اس سے یہ پاجامہ باعزت پاجاموں کی صف میں شامل ہو گیا۔ آدھی رات کے بعد ہم سوئے، اور جب آنکھ کھلی سورج اوپر آ گیا تھا۔ گاڑی شام سات بجے جاتی تھی۔ یہ دن بھی گذارا۔ میرے اس محسن بزرگ نے (اللہ انہیں اجر اور صلہ عطا فرمائے)، مجھے کافی پیسے دے کر رخصت کیا۔ یہی ہماری ضرورت تھی جو انہوں نے پوری کر دی۔

ایک ہندو نوجوان ہمسفر مجھے اپنی بہن کے پاس لے گیا

دلّی جانے والی اس گاڑی میں کچھ بھیڑ تھی۔ لیکن مسافروں نے مجھے بٹھا لیا، حالانکہ کپڑوں سے میں کسی اچھی حیثیت کا آدمی نہیں لگتا تھا۔ میرے سامنے ایک دبلا پتلا سانولا سا نوجوان بیٹھا تھا۔ میں نادر اور طارق کے متعلق متفکر تھا اور دعا کر رہا تھا کہ وہ خیریت سے ہوں۔ اُن سے جدا ہوئے دو دن گذر گئے تھے۔ فرار کی حالت میں دو دن بڑا ہی لمبا اور خطروں سے بھرپور عرصہ تھا۔ مجھے اپنے سامنے بیٹھے نوجوان نے چونکا دیا۔ وہ شاید میرے ساتھ باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ جودھپور کا رہنے والا ہندو تھا۔ اس کی ذات برادری چوہان تھی اور نام جے سنگھ۔ اس نے بتایا کہ جودھپور یونیورسٹی میں بی۔ اے فائنل کا طالب علم ہے۔

تعارف کے جواب میں مجھے اپنا تعارف کرانا چاہیئے تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا نام رحیم ہے اور میں مسلم راجپوت ہوں۔ میں نے اپنے لباس کے پیشِ نظر اپنی تعلیم

میٹرک بتائی، اور یہ بھی کہ میرے والد صاحب متمول انسان ہیں، لیکن میں انقلابی خیالات کا علمبردار ہوں۔ میرے کپڑے مفلسی اور جہالت کے مظہر تھے۔

فرار کے لئے جسمانی پھرتی کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی دماغی مستعدی کی۔ یہاں مجھے اپنے دماغ کو حاضر رکھنا تھا۔ جے سنگھ چوہان مجھ میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا تھا۔ میرے منہ سے کوئی نقصان دہ بات بھی نکل سکتی تھی۔ میں نے خطروں کو بھانپا تو خیال آیا کہ یہ نوجوان ہندی میں باتیں نہ کرنے لگے۔ میں نے باتوں باتوں میں اس پر ظاہر کر دیا کہ میں ہندی نہیں جانتا۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے والد صاحب کے ایک دوست کی اولاد نہیں ہے۔ وہ مجھے اُس وقت اپنا بیٹا بنا کر یو پی لے گئے تھے جب میں نے ابھی ہوش سنبھالے تھے۔ انہوں نے ہی مجھے تعلیم دلائی اور میری پرورش کی۔ وہاں مجھے اردو اور انگریزی کی تعلیم دی گئی۔

جے سنگھ مطمئن ہو گیا اور بولا۔ "ہندی بڑی آسان زبان ہے۔ آپ جلدی سیکھ جائینگے یو پی کی انگریزی تعلیم بہت اچھی ہے۔ اسی لئے آپ میٹرک پاس ہوتے کے باوجود اتنی روانی سے بول لیتے ہیں جو میں بی۔ اے کا طالب علم ہوتے کے باوجود نہیں بول سکتا۔"

گپ شپ لگانا میری ضرورت تھی، لیکن یہ نوجوان میری باتوں سے بہت ہی متاثر ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ گاڑی کی ڈائننگ کار (کھانے کے ڈبے) میں لے گیا اور کھانے کا آرڈر دینے سے پہلے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کھانا پسند کروں گا۔ میں نے جواب دیا کہ گوشت نہیں کھاؤں گا اور جو جی چاہے منگوا لیں۔ اس نے کہا: "میں بھی VEGETARIAN (سبزی خور) ہوں۔" کھانا آیا۔ ہم نے کھایا اور اپنے ڈبے میں چلے گئے۔ زیادہ تر مسافر سو گئے تھے۔ ہم نے بھی بیٹھے بیٹھے سونے کی کوشش شروع کر دی۔

۱۷ر ستمبر ۱۹۷۲ء کی صبح طلوع ہونے سے پہلے ہماری گاڑی نئی دلّی ریلوے سٹیشن پہنچی۔ میں نے اپنے نوجوان ہمسفر جے سنگھ چوہان سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی مگر اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور اس کی بہن سے ملوں۔ اس کی

بہن نہرو یونیورسٹی دلّی میں پروفیسر تھی۔ میں نے پھر کبھی ملنے کا وعدہ کر کے اسے ٹالا، لیکن اس نے شدید ضد شروع کر دی۔ اس کی ضد میں رسم یا تکلف نہیں تھا۔ وہ مجھے ہر قیمت پر اپنے ساتھ لے جانے پر تلا ہوا تھا۔ میرے لئے گلو خلاصی نا ممکن ہو گئی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ان حالات میں میرا کسی ہندو عورت سے ملنا خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا، مگر میں اس کی اتنی ضد کو ٹال کر بھی اپنے خلاف شک پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کی بہن کے پاس جانے پر آمادہ ہو گیا۔

ایک حجام کی دکان سے شیو بنوائی، کنگھی کی اور باہر آیا تو جے سنگھ نے مجھے ایک موٹر رکشا پر بٹھایا اور بہن کے گھر لے گیا۔ اس کی بہن ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ ہم دونوں نے اسے نمستے کہا۔ جے سنگھ نے اسے پریشان کرنے کے لئے کہا کہ اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ وہ مارواڑی زبان بولتے تھے۔ میں بھی یہی زبان بول رہا تھا۔ غالباً یہ مشترکہ زبان اس انس کا باعث بن گئی تھی۔ اس عورت نے ناشتہ تیار کرایا۔ میرے لئے ناشتے میں تو بہت کشش تھی، لیکن میں چوکنا اور مستعد تھا۔ منہ سے جو بات نکلتا وہ اچھی طرح تول کر نکالتا۔ اسی کیفیت میں ناشتہ کیا۔

طارق ایک مندر میں نادر پہچانا گیا

دس بجنے والے تھے۔ مجھے نادر اور طارق کے پاس بہت جلدی پہنچنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے انتظار میں ان کا کیا حال ہو رہا ہو گا۔ ہم نے طے کیا تھا کہ میں انہیں نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب "سندھ پنجاب ہوٹل" میں ملوں گا۔ میں نے اپنے ہندو میزبانوں سے اجازت چاہی تو جے سنگھ اور اس کی بہن نے اصرار شروع کر دیا کہ میں دوپہر کا کھانا کھا کر جاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ کانپور سے میرے دوست آ رہے ہیں۔ مجھے ان کے استقبال کے لئے ریلوے سٹیشن جانا ہے۔ جے سنگھ نے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گا۔ عجیب

منز بھرا نوجوان تھا۔ اگر میں نے اسے اپنی باتوں وغیرہ سے اتنا زیادہ متاثر کر لیا تھا تو میری یہ حرکت قابلِ مذمت تھی۔ وہ تو میرے ساتھ چپک گیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اُسے ساتھ لے جاتے۔ مجھے خوشی ہوتی، لیکن اپنے دوستوں کو گاڑی سے اتار کر دو چار جگہوں پر لے جانا ہے، اس سے اسے بوریت ہو گی۔ میں نے وعدہ کیا کہ ان سب کو اس کے گھر لاؤں گا۔

لڑکا خوش ہو گیا۔ اس کی بہن بھی مان گئی۔ میں نے نمستے کہا اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ باہر نکلتے ہی رکشا مل گیا۔ اسے کہا کہ نظام الدین اولیاء کے مزار تک پہنچا دے۔ اس نے پہنچا دیا۔ "سندھ پنجاب ہوٹل" کے اندر اور باہر دیکھا۔ میجر نادر اور میجر طارق کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں ہوٹل میں بیٹھ گیا۔ ایسے ایسے وہم آئے کہ دل تڑپ تڑپ اٹھا۔ اگر وہ پکڑے گئے تھے تو مجھے بھی ان کے ساتھ پکڑے جانا چاہیئے تھا۔ میں صرف اپنے لئے تو مدد نہیں لینے گیا تھا۔

اتنے میں ہوٹل کا دروازہ کھلا اور میجر نادر داخل ہوئے۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میجر طارق ان کے ساتھ نہیں تھے۔ نادر نے بتایا کہ طارق بالکل خیریت سے ہے۔ پھر انہوں نے مجھے ایک اخبار دکھایا۔ جس میں ہمارے فرار کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اس میں فرار ہونے والوں کی تعداد پانچ لکھی تھی۔ سب کے نام بھی لکھے تھے۔ خبر کے ساتھ ہمارے فوٹو نہیں دیئے گئے تھے۔ دوسرے دو کیپٹن ظفر حسین گل اور لیفٹیننٹ ولیئم تھے۔ یہ دونوں ہمارے بعد سرنگ سے نکلے ہوں گے۔ ہم نے اپنے فرار کی خبر دلچسپی سے پڑھی۔ مجھے اپنے ان ساتھیوں کا خیال آیا جو کیمپ میں رہ گئے تھے۔ ہمارے کئے کی سزا انہیں مل رہی ہو گی، اور ملی بھی تھی۔

ہم دونوں چائے پی کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ میں نے میجر نادر کو اپنی کارگزاری سنائی جس سے انہیں بہت اطمینان ہوا۔ کچھ دور ریلوے پر لتے مندر دکھائی دے رہے تھے۔ نادر کے کہنے کے مطابق طارق ان مندروں میں تھے۔ نادر نے مجھے بتایا کہ انہوں نے یہ دو دن اور دو راتیں کہاں اور کیسے گزاری ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے دلّی سے رخصت کر کے وہ دونوں نظام الدین اولیاء کے مزار پر چلے گئے تھے۔ انہوں نے درگاہ

کے انچارج سے رات ٹھہرنے کی درخواست کی۔ انہیں اجازت مل گئی۔ انہوں نے رات کا کھانا مزار کے لنگر سے کھایا اور وہیں سو گئے۔ صبح جاگے اور وہیں کہیں بیٹھے تھے کہ انہیں آواز سنائی دی "میجر صاحب کیا حال ہے؟"

فرار اور دیارِ غیر میں یہ آواز اس تیر کی مانند تھی جو سینے میں اتر گیا ہو۔ میجر نادر پرویز نے دیکھا۔ ایک آدمی انہیں گھور رہا تھا۔ یہ آواز اس کی تھی۔ کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ پہچانے اور پکڑے گئے ہیں۔ اٹھ بھاگنا مناسب نہیں تھا۔ میجر نادر نے اُسے کہا: "آپ کو شاید غلطی لگی ہے۔ میں میجر نہیں ہوں"۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں"۔ اس آدمی نے کہا: "آپ مشرقی پاکستان میں جیسور میں تھے۔ میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ بڑا اچھا کاروبار تھا۔ مکتی باہنی نے سب کچھ لوٹ لیا۔ اپنی جان بچا کر آیا ہوں"۔

نادر اور طارق کی جان میں جان آئی۔ وہ مشرقی پاکستان کا لٹا پٹا بہاری تھا۔ اس نے ابھی یہ نہیں پوچھا کہ آپ یہاں کیسے آئے۔ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ آپ کے لئے کھانے کے لئے کچھ لاتا ہوں۔ اس کے جاتے ہی نادر اور طارق وہاں سے غائب ہو گئے۔ اس آدمی کو اعتماد میں لینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ فرار کے راز کو چھپائے رکھنا کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرے دونوں دوست اِدھر اُدھر ہو گئے۔ رات کو انہوں نے فلم کا آخری شو دیکھا اور سڑک کے کنارے ایک لوہار کے چھپر تلے سو گئے۔ انہوں نے اگلی رات ان پرانے مندروں میں گزاری۔

میں اور میجر نادر پرانے مندروں میں پہنچ گئے۔ نادر کی راہنمائی میں ہم ایک مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ مندروں کا وہ علاقہ عجیب اور پُراسرار تھا۔ مندروں میں ہیبت اتنی تھی کہ اکیلا آدمی ان کے اندر جانے کی جرأت نہ کرے۔ ہم دونوں اس بھیانک مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے تو میجر طارق کو وہاں لیٹے ہوئے پایا۔ وہ سو رہے تھے۔ ہمارے قدموں کی آہٹ نے انہیں جگا دیا۔ وہ اچھل کر اٹھے اور مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔ ہم نے فوراً فرار کے اگلے اور آخری مرحلے پر بحث مباحثہ شروع کر دیا۔ طے ہوا کہ بمبئی چلا جائے اور کسی غیر ملکی بحری جہاز کے کپتان سے مل کر مدد طلب کی جائے۔ میں کافی رقم لے آیا تھا۔ فیصلہ کیا کہ میں

اپنے لئے کاٹن کی ایک پتلون خرید کر پاجامہ اتار دوں، اور میجر طارق کے لئے بھی کاٹن کی ایک پتلون اور ایک قمیض خریدی جائے۔ اور ایک تھیلا بھی۔

ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھا۔ بمبئی کے لئے گاڑی رات ساڑھے نو بجے جاتی تھی۔ ہم دوپہر کے وقت دلّی شہر چلے گئے۔ کناٹ پلیس اور چاندنی چوک سے ضرورت کی اشیاء خریدیں۔ پھر لال قلعہ دیکھنے چلے گئے۔ جامع مسجد بھی دیکھی۔ جذبات میں تیز و تند طوفان اٹھے جو ہماری ہچکیوں نے دبا لئے...... رات آٹھ بجے ریلوے سٹیشن گئے۔ میں ٹکٹ لینے گیا تو پتہ چلا کہ اس گاڑی کی ایڈوانس ریزرویشن ہوتی ہے، اور اب کوئی سیٹ خالی نہیں رہی۔ اس خبر نے ہم تینوں کو پریشان کر دیا۔ ہندوستان ہو یا پاکستان ایسی مشکلیں حل ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ ہم نے ایک قلی کو کچھ پیسے پیش کر کے کہا کہ بمبئی کی تین سیٹیں لے دے۔ اس نے انتظام کر دیا، لیکن صرف بیٹھنے کے لئے سیٹیں ملیں، سونے کے لئے نہیں، یہ بھی غنیمت تھی۔ ہم ٹکٹ لے کر سیٹوں پر جا بیٹھے اور ساڑھے نو بجے گاڑی چل پڑی۔

گاڑی ہمیں دلّی سے دور لے جا رہی تھی۔ اب چونکہ ہمارے پاس پیسے تھے اس لئے کھانا پینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلہ صرف ہندوستان سے نکل جانے کا تھا۔ ہمارے قریب جو مسافر بیٹھے تھے وہ اپنی فوج کی فتح پر خوش نہیں تھے جو اس نے مشرقی پاکستان میں حاصل کی تھی بلکہ وہ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ پاکستان کو تو جانے کیسے شکست ہو گئی ہے اور یہ کہ پاکستان انتقام ضرور لے گا۔ ان ہندوؤں پر خوف و ہراس طاری تھا۔

بمبئی میں غیر ملکی بحری جہاز کی تلاش

۱۳ ستمبر ۱۹۷۲ء کی صبح کے ساڑھے نو بجے رہے تھے جب ہماری گاڑی سنٹرل بمبئی کے ریلوے سٹیشن دادر پہنچی۔ ہمیں یہیں اترنا تھا۔ ہم اترے اور ریلوے سٹیشن سے باہر نکل گئے۔ آگے بہت ہی چوڑی سڑک تھی، اور دو طرف بس شاپ کے

شپیڈ۔ ہم نے ڈاک یارڈ (بندرگاہ) کی گودی، جانے والی بس کا نمبر کسی سے
پوچھا اور جب اس نمبر کی بس آئی تو ہم اس پر سوار ہو کر ڈاک یارڈ پہنچے۔ وہاں جہازوں
کا ہجوم کھڑا تھا مگر ان میں کوئی ایک بھی غیر ملکی نہیں تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر روز
صبح آٹھ بجے یہاں آیا کریں گے اور کوئی غیر ملکی جہاز آیا تو اس کے کپتان سے ملیں گے۔

اگلا مسئلہ رہائش کا تھا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ قریب ہی ڈونگری بازار
اور بھنڈی بازار ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے مسافر خانے ہیں اور وہاں کم داموں پر
کمرے مل جاتے ہیں۔ ہم وہاں گئے مگر دو تین جگہوں سے صاف جواب مل گیا۔ کوئی جگہ
نہیں تھی۔ آخر "اسماعیلیہ لاج" نام کے ایک مسافر خانے میں بڑی مشکل سے ایک کمرہ ملا۔ اس
میں دو چارپائیاں تھیں اور کرایہ سات روپے یومیہ۔ ہم نے اسی میں انہی پیسوں میں بستر لگا
لیا۔ ان کمروں کے ساتھ غسلخانے نہیں تھے۔ کونے میں پانی کا ایک ڈرم پڑا تھا۔ یہی غسلخانہ
تھا۔ کمرے میں ایک بلب اور ایک پنکھا بھی تھا اور بیرا بھی آتا جاتا تھا۔ کسی چیز کی ضرورت
ہو تو بیرے کو کمیشن دے کر منگوائی جا سکتی تھی۔

یہ دونوں بازار مسلمانوں کے ہیں۔ وہاں گائے کا گوشت بھی مل سکتا ہے۔
"اسماعیلیہ لاج" میں کھانے کا انتظام نہیں تھا۔ ہم قریب کے ایک ہوٹل سے
کھانا کھاتے تھے۔ سوا روپے فی کس کے حساب سے ایک وقت کے لئے پیٹ
بھر کر روٹی مل جاتی تھی۔ پہلے روز ہم نے غسل کیا۔ کپڑے دھوئے اور ہمارا
حلیہ کچھ درست ہو گیا۔ پھر ہم سو گئے۔ تھکن نے ہمارا بہت برا حال کر
رکھا تھا۔

اگلی صبح آٹھ بجے ڈاک یارڈ گئے۔ کسی غیر ملکی بحری جہاز کو ڈھونڈتے
دو بج گئے اور ہم مایوس لوٹ آئے۔ ہم نے اخباروں میں اپنے فرار کی ایک
اور خبر پڑھی۔ لکھا تھا کہ فرار ہونے والے پانچ پاکستانی افسروں کی گرفتاری
کے لئے مکمل ناکہ بندی کر دی گئی ہے اور گھر گھر تلاشی لی جا رہی ہے۔ ہم چوکنے
ہوئے کیونکہ بمبئی کی بندرگاہ بھی ناکہ بندی میں شامل ہو سکتی تھی۔ ہمیں ان
گھروں کے متعلق افسوس ہونے لگا جن کی تلاشی لی گئی اور لی جا رہی تھی۔ ہم

اپنے ڈھونڈنے والوں کو کیسے بتاتے کہ ہم کسی گھر میں نہیں چھپے۔ بہانہ بنا کر
مسلمانوں کے شریف گھرانوں کو پریشان نہ کرو۔ ہمیں گھروں سے باہر ڈھونڈو
مگر ہم کسے بتاتے کیسے بتاتے!

ہم جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں ہم نے کئی ایک مسلمانوں کو بتایا کہ ہم
مشرقی پاکستان کے لٹے پٹے لوگ ہیں۔ وہاں سے جانیں بچا کر کئی مہینوں سے
ہندوستان میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ پاکستان جانے کی کوئی صورت
نہیں بنتی۔ ہماری اس "دردناک" کہانی سے کئی مسلمانوں کے دلوں میں ہمدردی
پیدا ہو گئی مگر اس ہمدردی کے سوا ان سے کچھ نہ ملا۔ بعض نے کہا کہ وہ ہندو
حکومت کی انتقامی کارروائی سے ڈرتے ہیں اس لئے ہماری کوئی مدد نہیں کر
سکتے۔ ایک نے بتایا کہ ڈونگری بازار میں ایک افغانی ہے جو لوگوں کو
دوسرے ملکوں کو بھیجنے کا کاروبار کرتا ہے۔ ہم اس سے مدد لے سکتے تھے مگر
لیکن بندرگاہ سے ہم ابھی پوری طرح مایوس نہیں ہوئے تھے۔ بہر حال
ہم نے اس افغانی کو متبادل انتظام کے طور پر پیش نظر رکھا۔

ہمارا معمول یہ تھا کہ باہر ذرا کم ہی نکلتے تھے۔ اندھیرے میں چہل قدمی کے لئے جاتے
اور کھانا کھا کر کمرے میں واپس آ جاتے تھے۔ بمبئی میں دو اچھی فلمیں لگی ہوئی تھیں۔
"مغل اعظم" اور "پاکیزہ"۔ ہم نے "پاکیزہ" دیکھی، لیکن متاثر نہ ہوئے۔ جوں جوں دن
گزرتے جا رہے تھے، پیسوں میں کمی آتی جا رہی تھی۔ پیسے بچانے کے لئے ہم نے چوبیس
گھنٹوں میں صرف ایک ڈبل روٹی اور ایک ایک کپ چائے پر گزارہ کرنا شروع کر
دیا جس سے جسم کمزور ہونے لگے۔ ہمارے پاس وٹامن کی گولیاں تھیں۔ ان سے غذائیت
کی کمی پوری کرتے رہے۔

ڈاک یارڈ میں کسی غیر ملکی بحری جہاز کا سراغ نہ ملا۔ مایوسی ہونے لگی۔ پیسے ختم
ہونے کو آ گئے تھے۔ اس مالی پوزیشن میں ہم نیپال کو بھی نہیں جا سکتے تھے۔ لنکا چلے جانا
بھی بعید از قیاس تھا۔ ایک روز ہم گیارہ بجے سے شام پانچ بجے تک ڈاک یارڈ پر
گھومتے پھرتے رہے۔ ہمارے مطلب کا کوئی جہاز نظر نہ آیا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں

کسی دردمند مسلمان کی تلاش کی جائے جو ہمیں نیپال تک جانے کے لئے قرض حسنہ دے دے۔ فرار ہوئے دس روز گذر گئے تھے اس لئے ہمیں یہ توقع تھی کہ ہندوستانی نیپال کی طرف ہمیں ڈھونڈ چکے ہوں گے اور اب وہ راستہ محفوظ ہوگا۔ جس روز ہم نے یہ فیصلہ کیا اس رات ہم نے پیسوں کی کمی کی وجہ سے کھانا نہ کھایا۔

دوسرے ہی دن ہم نے مختلف مسلمانوں سے ملنا شروع کر دیا۔ ہر کسی کو ہم ایک ہی فرضی کہانی سناتے تھے کہ ہم مشرقی پاکستان کے لٹے پٹے لوگ ہیں۔ جانیں بچا کر بھاگے ہیں، کئی مہینوں سے ہندوستان میں مارے مارے پھر رہے ہیں، مغربی پاکستان جانے کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ ہمارا انداز بھکاریوں والا نہیں تھا۔ ہم انہیں کہتے تھے کہ ہمیں کچھ رقم قرض کے طور پر دے دیں، جو ہم کسی نہ کسی طرح پاکستان سے واپس کر دیں گے......
ہر مسلمان نے ہماری بات دلی ہمدردی سے سنی، مگر کسی سے بھی ہمدردی کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ تاہم ہم مایوس نہ ہوئے۔ کوشش اور مہم جاری رکھی۔

ایک پولیس آفیسر کے گھر میں

ہم ایک روز بھنڈی بازار سے سنٹرل بمبئی جانے والی سڑک پر جا رہے تھے، ایک چار منزلہ عمارت کے قریب سے گذرتے ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ یہ کوئی نقوی صاحب وکیل تھے۔ ہم نے اسی کی کال بیل (دروازے کی گھنٹی) کا بٹن دبایا۔ بند دروازے کے پیچھے سے ایک نسوانی آواز نے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کسے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ نقوی صاحب سے ملنا ہے۔ جواب ملا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں شام پانچ بجے آئیں گے۔ ہم مایوس لوٹے۔
یہ گھر بالائی منزل پر تھا۔ ہم نیچے آئے تو ایک کمرے کے دروازے پر ایک تختی پر نظر پڑی۔ یہ کوئی تقوی صاحب تھے۔ نام سے مسلمان تھے۔ میں نے میجر طارق سے کہا "چلو یار! نقوی نہ سہی تقوی ہی سہی۔" اور میں نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر آیا۔ سلام دعا کے بعد وہ ہمیں اندر لے گیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا ——— "فرمایئے،

میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"
ہم نے اسے اپنی فرضی کہانی سنا کر مدعا بیان کیا۔ اس نے کہا "دو مہینے پہلے تک میں واہگہ بارڈر پر تھا۔ پھر میری تبدیلی بمبئی کر دی گئی۔ یہاں سے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

ہم نے کہا کہ ہمیں کچھ رقم بطور قرض دے دیں، جو ہم جب بھی موقع ملا پاکستان سے واپس کر دیں گے، مگر تقوی صاحب سے بھی ہمدردی کے سوا کچھ نہ ملا۔ اچانک میری نظر ایک ٹوپی پر پڑی جو پولیس کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ جناب تقوی صاحب پولیس آفیسر ہیں۔ میرا تو پسینہ نکل آیا۔ ہم مفرور جنگی قیدی ایک پولیس آفیسر کے گھر آن بیٹھے تھے۔ میں طارق کو اشارہ نہ کر سکا کہ وہ بھی پولیس کی ٹوپی دیکھ لے۔ میں نے تقوی صاحب کی بات ختم ہوتے ہی جانے کی اجازت چاہی مگر اس نے اصرار کیا کہ ہم چائے پی کر جائیں۔ میں نے پُر زور الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اجازت مانگی۔ مگر اس کی ضد اور اصرار نے اٹھنے نہ دیا۔ مجھے یہی ایک خطرہ نظر آ رہا تھا کہ وہ ہمیں چائے کے بہانے بٹھائے رکھے گا اور پولیس کو بلا کر ہمیں گرفتار کرا دے گا۔
وہ اندر چلا گیا۔ میں نے طارق کو پولیس کی ٹوپی دکھائی تو ان کی حالت بھی بگڑ گئی۔ ہم ہوشیار اور بوقت ضرورت بھاگنے کے لئے تیار ہو گئے۔ کان دروازوں کی طرف لگا دیئے۔
مسٹر تقوی واپس آ گیا اور اس نے نہایت دلچسپ باتیں شروع کر دیں۔ پھر چائے آ گئی۔ ہمیں چائے کی ضرورت تو تھی مگر اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم ذرا جلدی وہاں سے نکلنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چائے بہت گرم تھی۔ ہم نے جلدی جلدی منہ جلانے والی گرم چائے پی لی۔ لیکن کپ ابھی خالی نہیں ہوئے تھے۔ تقوی صاحب نے کپ ابھی آدھا بھی ختم نہیں کیا تھا۔ ہم ایک لمحہ بھی نہیں رکنا چاہتے تھے، لیکن آداب کا تقاضہ تھا کہ جب تک میزبان چائے ختم نہ کرے ہم بیٹھے رہیں۔ مگر میزبان میزبان میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ہم محفل کے آداب کے پابند رہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مسٹر تقوی پولیس کے آداب دکھا جائیں۔ ہم دو فوراً اٹھے اور شکریہ ادا کر کے رسمی طور پر اجازت مانگی۔ مسٹر تقوی کچھ بیزار سے ہوئے اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ اس موقع پر میجر نادر ہمارے ساتھ نہیں تھے۔

سارا دن سڑکوں پر پیدل مارے مارے پھرنے سے سر منہ گرد سے اَٹ گئے تھے۔ کمرے میں جا کر نہائے اور سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہمیں کوئی راستہ نکالنا تھا اور بہت جلدی نکالنا تھا۔ پولیس کی ڈیوٹی نے ایمرجنسی کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ کسی مسجد میں جا کر پیش امام کو اپنی فرضی کہانی سنائیں اور انہیں کہیں کہ وہ ہمیں کسی ایسے متمول انسان سے ملا دیں جو قرض کے طور پر ہماری مدد کر سکے اس فیصلے کے تحت میں اور طارق ڈونگری بازار کی مسجد میں چلے گئے۔ عشاء کی نماز ختم ہو چکی تھی اور پیش امام صاحب جا چکے تھے۔ پوچھنے پر علم ہوا کہ اپنے حجرے میں ہیں۔ حجرہ مسجد سے ملحق مدرسے کی اوپر والی منزل میں تھا۔ ایک آدمی نے راہنمائی کی اور ہم اوپر چلے گئے۔

دستک دی تو مولانا نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گئے۔ ہم نے اپنی فرضی کہانی سنائی۔ اور مدعا بیان کیا۔ انہوں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مالی حیثیت ایسی نہیں کہ ہماری مدد کر سکیں ۔ انداز بتا رہا تھا کہ وہ متاثر ہوئے ہیں اور کچھ نہ کچھ کریں گے ضرور۔ انہوں نے کہا کہ ہم کل فجر کی نماز کے وقت مسجد میں آ جائیں، وہ کوشش کریں گے کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔ مسئلہ حل ہوتا نہ ہوتا مولانا کا سلوک اور گفتگو اتنی پیاری تھی کہ ہمارے دلوں سے مایوسی کی تلخی کم ہو گئی۔ ہم اپنے کمرے میں گئے اور اللہ کے سہارے سو گئے۔

پیش امام کا کارنامہ

مسلمان فلم سٹاروں کا کھوکھلا پن

میں اور طارق فجر کی نماز کے وقت مسجد میں گئے۔ باجماعت نماز پڑھی۔ نماز کے بعد پیش امام نے درسِ قرآن شروع کر دیا۔ انہوں نے جس موضوع کا انتخاب کیا، اس سے ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہماری کہانی اور ہماری مشکل سے متاثر ہیں۔ ان کا موضوع تھا مسلمانوں کی اخوت اور قابلِ امداد مسافروں کی مدد کرنا۔ انہوں نے قرآنی آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں

درس دیا۔ احادیث بھی سنائیں اور آخر میں انہوں نے غیر متوقع طور پر اس درس کا رخ ہماری طرف پھیر دیا۔ ہم دونوں کی طرف اشارہ کر کے سامعین سے کہنے لگے کہ ہمارے یہ دو بھائی مشرقی پاکستان میں اپنا سب کچھ لٹا آئے ہیں۔ اب پاکستان تک پہنچنے کے لئے انکے پاس سفر خرچ بھی نہیں اور یہ اپنے دشمن ملک میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ سب کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں تاکہ یہ جلد از جلد ہندوستان سے نکل جائیں۔

یقین کیجئے میں اور طارق شرم سے زمین میں گڑے جاتے تھے۔ ہمارا مطلب یہ نہ تھا۔ مگر ہمارے ردِ عمل کی کسی نے پرواہ نہ کی۔ اللہ ان مسلمانوں کو صلہ اور اجر عطا فرمائے۔ ان میں سے کئی اٹھ کر چلے گئے اور واپس آ گئے۔ کسی نے دس روپے دیئے، کسی نے دو اور کئی ایک نے ایک ایک روپیہ دیا۔ یہ تمام لوگ مفلس درجے سے تعلق رکھتے تھے، پھر بھی انہوں نے خاصی رقم جمع کر دی، مگر ہم نے یہ رقم قبول نہ کی۔ بعد شکریہ یہ رقم واپس کر کے انہیں کہا کہ ہم خیرات نہیں مانگ رہے اور نہ ہی فی سبیل اللہ امداد کے طلبگار ہیں۔ ہم نے اپنی درخواست دہراتے ہوئے کہا کہ ہمیں کوئی صاحب ہماری ضرورت کے مطابق رقم بطور قرض حسنہ دے دیں، جو ہم واپس کر دیں گے۔ ان میں ایک بھی ایسا متمول نہ نکلا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ جو ایک روپے سے دس روپے تک لائے ہیں وہ اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ رہے ہیں۔ ہم نے بڑے ہی جذباتی لہجے اور الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور رقم انہیں واپس دے کر مسجد سے نکل آئے۔

کمرے میں جا کر میجر نادر پرویز کو بتایا تو وہ پریشان ہو گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بمبئی میں جو مشہور مسلمان فلمی ایکٹر (سٹار) ہیں ان سے رجوع کیا جائے۔ ہم اسی روز متعدد مسلمان فلم سٹاروں سے ملے مگر ہر کسی نے یہ بزدلانہ جواب دیا کہ ہندوستان میں ہماری بہت عزت کی جاتی ہے اور ہمیں اونچا مقام حاصل ہے اگر حکومت کو پتہ چل جائے کہ ہم نے کسی پاکستانی کی مدد کی ہے تو ہماری اس حیثیت پر زد پڑے گی اور ہندو ہمیں انتقام کا نشانہ بنائیں گے .... ہم نے اس یقین کے ساتھ کہ یہ لوگ مکھ تپی ہیں انہیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ حکومت کو کیونکر پتہ چل سکتا ہے کہ انہوں نے ہماری

مدد کی ہے مگر وہ ہمیں صاف ٹال رہے تھے اور بے بنیاد بہانے تراشے جا رہے تھے۔

ہم نٹراج فلم سٹوڈیو میں گئے۔ ایک فلم سٹار سے ملنا تھا۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار نے ہمیں روک کر پوچھا کہ اس فلم سٹار سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ ہم نے چوکیدار کو اپنی فرضی کہانی سنا دی۔ وہ پٹھان تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو اندر سے بلا لیا اور پشتو میں اس سے باتیں کر کے ہمیں کہا کہ ہم کل پھر آئیں، وہ ہماری مدد کریں گے۔ فلم سٹار نہ مل سکا۔ ہم واپس آ گئے۔

اپنے کمرے میں بیٹھ کر ہم نے ایک فیصلہ کیا۔ اس کے تحت اگلے روز نٹراج سٹوڈیو جانے کا ارادہ ترک کر دیا، اور یہ سکیم بنائی کہ اپنی مدد آپ کے اصول پر کام کیا جائے ورنہ بمبئی سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں بنے گی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ کل ایک ٹیکسی میں سوار ہوں گے اور اسے کسی ویران علاقے میں لے جائیں گے۔ وہاں ڈرائیور کو مار کر اس سے نقدی نکال لیں گے۔ اسے وہیں پھینک دیں گے اور ٹیکسی خود چلا کر شہر میں کہیں کھڑی کر دیں گے۔ اس واردات سے خاصی رقم ملنے کی توقع تھی۔ ہم نے اس کا یہ پہلو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں باقی زندگی بمبئی کی جیل میں گذرے گی، مگر مجبوری ایسی تھی کہ ہمیں یہ خطرہ مول لینا تھا۔

ہم نے اپنے آپ کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کیا۔ حقائق اور خطرات کو سامنے رکھ کر ہم ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اس واردات کے لئے تیار ہو گئے اور سو گئے۔

صبح ہم دیر سے جاگے۔ کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس روز ہمارے شیڈول میں شام کی یہ واردات تھی۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم نے غسل کیا اور بے مقصد گھومنے پھرنے کے لئے باہر نکل گئے۔ ڈونگری بازار سے ہوتے ہوئے ہم بھنڈی بازار میں داخل ہوئے۔ اتفاق سے ہماری نظر چھوٹے سے ایک بورڈ پر پڑی۔ ہم نے یہ بورڈ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں اس کی تفصیلات نہیں بتاؤں گا۔ اس بورڈ نے ہماری راہنمائی کی اور ہم ایک جگہ پہنچ گئے۔ وہاں بھی ہم نے اپنی فرضی کہانی سنائی۔ وہاں سے جواب ملا کہ شام چار بجے آئیں، کچھ انتظام

ہو جائے گا۔

مایوسی کے عالم میں شام چار بجے وہاں گئے تو یہ معلوم کر کے بھی ہمیں یقین نہ آیا کہ ہمارے لئے رقم کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ رقم ہمیں دے بھی دی گئی جو ہم نے رقت آمیز شکریہ کے ساتھ لے لی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان محسنوں کے نام پتے ظاہر نہیں کر سکتا۔ ہم تمام عمر ان کے احسان مند رہیں گے۔ انہوں نے ہمیں لکھنؤ کے ایک صاحب کے نام خط بھی دے دیا اور ان کے گھر کا اتا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا۔

بمبئی کے مہمان لکھنؤ میں
پھر اور آگے

اپنے کمرے میں آ کر ہم نے بمبئی سے فوراً لکھنؤ کے لئے روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ لکھنؤ کو رات ساڑھے نو بجے گاڑی جاتی تھی۔ ہم رات اس گاڑی میں بیٹھے اور گاڑی چل پڑی۔ ہم اُدھر کو ہی جا رہے تھے جدھر سے فرار ہو کر آئے تھے۔ پکڑے جانے کا خطرہ بدستور سر پہ منڈلا رہا تھا۔ کوئی بھی ہمیں اتفاقیہ غور سے دیکھ لے تو ہم اسے سی۔ آئی۔ ڈی یا ملٹری انٹیلی جنس کا آدمی سمجھ لیتے تھے، لیکن ہم کسی مشکوک ردِعمل کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اللہ کو قدم قدم پہ یاد کرتے تھے۔ اب ہم دو طرح کی خوشی سے سرشار تھے۔ ایک یہ کہ بمبئی سے نکل آئے اور سوئے منزل جا رہے تھے اور دوسری یہ کہ بمبئی کا کوئی ٹیکسی ڈرائیور ہمارے ہاتھ سے بچ گیا تھا۔

فاصلے پریشان کن تھے۔ لکھنؤ بہت دور تھا۔ گاڑی اچھی رفتار سے جا رہی تھی، مگر ہم محسوس کرتے تھے جیسے چیونٹی کی چال چل رہی ہو۔ خدا خدا کر کے

۲۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کی صبح نو بجے کے کچھ بعد گاڑی لکھنؤ کے قریب پہنچی۔ سگنل نیچے نہ ہونے کی وجہ سے مضافاتی سٹیشن چہار باغ سے باہر رُک گئی۔ ہم وہیں اتر گئے۔ تھوڑی دور پیدل چلے اور پھر ایک رکشا میں سوار ہوئے۔ اسے ایڈریس بتایا تو رکشا والے نے کُل دس منٹ میں پہنچا دیا۔ جن صاحب کے نام خط تھا ان کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دِقت نہ ہوئی۔ وہ گھر مل گئے۔ خط دیا تو انہوں نے پڑھ کر یقین دلایا کہ وہ پوری مدد کریں گے۔

انہوں نے ایک صاحب کے نام خط لکھا۔ ہمیں ایڈریس دیا۔ یہ صاحب نیپال کی سرحد کے ساتھ ایک شہر میں رہتے تھے۔ ہمارے میزبان نے ہمیں تسلی دی کہ یہ صاحب ہمیں سرحد پار کرا کے نیپال میں داخل کر دیں گے۔

ہم وقت ضائع کئے بغیر روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن وہ اصرار کر رہے تھے کہ دوپہر کا کھانا کھا کر جائیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ یہ ایمرجنسی ہے، زیادہ رکنا مناسب نہیں۔ وہ سمجھ گئے اور ہم ان کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں سب حضرات کو خراجِ تحسین پیش کروں۔ وہ دراصل ہم تین افراد کی نہیں پورے پاکستان کی مدد کر رہے تھے۔

کوئی چھ گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم اُس سرحدی شہر میں پہنچ گئے۔ یہاں بھی ہمیں اس ایڈریس پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی جو ہمیں دیا گیا تھا۔ جب ہم نے ان کے دروازے پر دستک دی اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ دس گیارہ سال کی عمر کا ایک بچہ باہر آیا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ ہم نے اُسے بتایا کہ اَبا حضور سے کہو کہ بمبئی سے مہمان آئے ہیں۔ بچہ اندر گیا اور ایک بزرگ دروازے پر آئے۔ تین اجنبیوں کو اپنے دروازے پر کھڑے دیکھا تو بولے "فرمایئے"۔ ہم نے کہا۔ "اگر اندر آنے کی اجازت ہو تو تفصیل بات کریں گے۔" انہوں نے "آیئے بسم اللہ" کہہ کر ہمیں اندر چلنے کو کہا۔

ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے اور اپنی فرضی کہانی سنا ڈالی۔ بڑے میاں نے ہماری کہانی بہت غور سے سنی اور کہا۔ "مجھے آپ کی مدد کرنی چاہیئے" وہ خط بھی پڑھ چکے تھے جو ہم نے انہیں دیا تھا۔ اتنے میں ان کا بڑا بیٹا آ گیا۔ تعارف ہوا۔ باپ بیٹا اندر چلے گئے۔ ہم کچھ خدشہ محسوس کرنے لگے۔ یہ میں نے خاص طور پہ دیکھا تھا، کہ بڑے میاں ہمیں ضرورت سے زیادہ ہی اوپر تلے سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا باوقار چہرہ اور ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ معمولی سی نظروں والے انسان نہیں۔ دنیا کو غور سے دیکھا اور انسانوں کو پڑھا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اندر گئے تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دال میں کچھ کالا تھا۔

کچھ دیر بعد بڑا بیٹا ہمارے پاس آیا اور ہمیں اندر چلنے کو کہا۔ اس کے انداز سے ہم کچھ نہ سمجھ سکے۔ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ اندر جائیں یا باہر نکل جائیں۔ ہم اس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ اس کمرے میں صوفہ سیٹ پڑا تھا، اور چائے کچھ لوازمات کے ساتھ رکھی تھی۔ نمکین اشیاء کے ساتھ میٹھی اشیاء بھی تھیں۔ اور وہاں اب بڑے میاں کے ایک بیٹے کے بجائے چار بیٹے تھے۔ سب اچھی طرح ملے اور ہمارے ساتھ چائے پر بیٹھ گئے۔ مگر بڑے میاں ہم سے دس گز دور ایک صوفے پر بیٹھے رہے۔ میں نے انہیں دو چار بار دیکھا تو میرے دل میں جو شک تھا وہ پختہ ہونے لگا۔ وہ صاحب کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔

ہم چائے پی رہے تھے کہ ہمیں بڑے میاں کی آواز سنائی دی۔ وہ انگریزی زبان میں کہہ رہے تھے۔

"GENTLEMEN; I AM QUITE CERTAIN THAT YOU ARE OUT OF THOSE PRISONERS OF WAR WHO HAVE ESCAPED FROM SOME OF THE CAMPS VERY RECENTLY."

"حضرات! مجھے بالکل یقین ہے کہ آپ اُن جنگی قیدیوں
میں سے ہیں جو حال ہی میں کسی قیدی کیمپ سے
فرار ہوئے ہیں۔"

میرے منہ میں چائے کا جو گھونٹ گیا تھا وہ برف کا ٹکڑا بن کر حلق میں اٹک گیا۔ نادر اور طارق کی کیفیت بھی یہی ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گھبرانے لگے۔ کمرے میں ایسا سکوت طاری ہو گیا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دینے لگیں۔ ہماری اتنی محنت اور جان لیوا تگ و دو ایک مسلمان کے گھر آ کر تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں آپ کبھی ایسی کیفیت سے گزرے ہیں یا نہیں جب کوئی غیر متوقع واقعہ یا خبر ذہن کو ایک خلا میں بدل دیتی ہے۔ آپ کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں رہتے۔

میں بتا نہیں سکتا کہ یہ سکوت کتنا لمبا تھا۔ ہو سکتا ہے۔ نصف یا پَون منٹ کا ہو لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کائنات ابد سے خاموش ہے اور ازل تک خاموش رہے گی.... بڑے میاں نے اس سکوت کو ان الفاظ سے توڑا:

"EVEN THEN I HAVE DECIDED TO HELP YOU."

"اس کے باوجود میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ آپ کی مدد کروں گا۔"

کائنات ایک بار پھر حرکت میں آ گئی۔ میں نے قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:

"NO, NO, WE ARE NOT OUT OF THOSE POWs WHO HAVE ESCAPED FROM SOME OF THE CAMPS VERY RECENTLY."

"نہیں، نہیں۔ ہم ان جنگی قیدیوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کیمپ سے فرار

ہوئے ہیں۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا:

"GENTLEMEN; I SHALL NOT TRY TO REFUTE YOU BUT THIS IS MY PERSONAL APPRECIATION. I MAY BE WRONG ALSO."

"حضرات! میں آپ کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کروں گا، لیکن یہ میرا ذاتی اندازہ ہے۔ میں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔"

ہم نے اس بزرگ کو جھٹلانے کی کوشش تو کی، لیکن دل میں ہم ان کی انسان شناسی اور باریک بینی کی داد دیئے بغیر رہ نہ سکے۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی اس میں بڑے میاں نے ہمارے تمام وہم اور خدشے ختم کر دیئے۔ وہ پاکستان کے شیدائیوں میں سے تھے۔ ان کی گفتگو تحریکِ پاکستان سے شروع ہوئی اور سقوطِ ڈھاکہ پر آ ختم ہوئی۔ رات گئے تک پاکستان ہی موضوعِ سخن رہا۔ اس کے بعد ایک تخت پر بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھایا۔ ہمارے بزرگ میزبان نے انواع و اقسام کے کھانے ہمارے لئے تیار کرائے تھے۔ ہم تینوں ایسی مرغن غذاؤں کے عادی نہیں رہے تھے۔ تھوڑا سا کھا کے ہی پیٹ بھر گیا۔ مگر بڑے میاں کی ضد کہ اور کھاؤ ہمیں زبردستی کھلائے جا رہے تھے۔

سونے کے لئے جو بستر بچھائے گئے وہ نرم و گرم تھے۔ بڑی ہی گہری نیند آئی اور بے خبری سے سو گئے۔ مایوسی یا بے فکری کی نیند سونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے اس بزرگ میزبان نے رات کھانے کے بعد ایسے متعدد حضرات کے نام خط لکھ کر ہمیں دے دیئے تھے جو ہندوستان سے نکالنے میں مدد دے سکتے تھے۔

آخری مرحلہ

وہ ۳۰۔ ستمبر ۱۹۷۲ء صبح تھی، پانچ بجے اس بزرگ ہستی کے سب سے چھوٹے بیٹے

نے ہمیں جگایا۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور فوراً بعد ان سے بڑے ہی جذباتی انداز سے ہم رخصت ہوئے۔ ان کا چھوٹا بیٹا کچھ دور تک ہمارے ساتھ آیا..... گیارہ بجے کے بعد ہم نیپال کی سرحد کے قریب بڑے میاں کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے وہ صاحب ملے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہم سے بچھڑے ہوئے ملے ہیں۔ وہ اور وہاں کے اور مسلمان بھی پاکستان کے نام پر فدا ہو ہو جاتے تھے۔ پاکستان سے ایسی عقیدت شاید پاکستانیوں کو بھی نہ ہو۔

دوپہر کا کھانا اسی گاؤں میں کھایا اور کھانے کے بعد ایک دلچسپ واقعہ ہو گیا ہُوا یوں کہ کھانے کے بعد طشتری میں پان پیش کئے گئے۔ میجر نادر اور میجر طارق پان پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا انہوں نے شکریہ ادا کیا۔ میں نے پان منہ میں ڈال لیا اور ساتھ ہی تمباکو کو خوشبو سمجھ کر منہ میں ڈال لیا۔ چبایا تو حلق میں کھچاؤ سا محسوس ہوا۔ میں سمجھا کتھا یا چونا ٹھیک نہیں، اس لئے برداشت کیا مگر تمباکو حلق سے اتر کر نیچے گیا تو پیٹ میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے باہر جا کر پان منہ سے اگل دیا۔ مگر تکلیف کم نہ ہوئی۔ میرے چہرے کے تاثرات اور بے چینی سے ہمارے میزبان بھانپ گئے انہوں نے فوراً میٹھا دہی منگوایا جو مجھے دیا گیا۔ یہ پیٹ میں گیا تو کچھ چین آیا۔ مجھے اور دہی دیا گیا۔ اس سے طبیعت بحال ہو گئی۔ میزبان جان گئے تھے کہ میں غلطی سے تمباکو کھا گیا ہوں۔

اس کے بعد ہم سو گئے اور ساری دوپہر گہری نیند سوئے رہے۔ میزبان نے ہمیں جگایا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ ہم جلدی سے اٹھے اور فرار کے آخری مرحلے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہندوستان اور نیپال کی سرحد آزاد ہے۔ ادھر اُدھر آنے جانے کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہیں کسٹم چوکی موجود ہے، جہاں سمگلنگ کی روک تھام کے لئے سامان کی چیکنگ ہوتی ہے۔ اس چوکی پر کسی بھی آدمی کو روکا جا سکتا ہے۔ یہی ایک خطرہ تھا کہ ہم چوکی کے سامنے سے نہیں گزرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ ہماری تصویریں وہاں پہنچ

چکی ہوں یا ہمیں روکنے کے لئے وہاں کوئی بیٹھا ہو۔

اس خطرے سے بچنے کے لئے ہمارے میزبان نے کسی اور جگہ سے ہمیں سرحد پار کرنے کا انتظام کر دیا۔ انہوں نے ہمیں ایک گائیڈ دے دیا جو اس کام کا ماہر تھا۔ وہ ہمیں چوکی سے کچھ دور لے گیا۔ اور سرحد پار کرا دی ——— اب ہم ہندوستان سے آزاد تھے۔ آپ ہماری مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے اور آپ ہمارے ان جذبات کا بھی اندازہ نہیں کر سکتے جو ان تمام مسلمان محسنوں کو یاد کر کے امڈ آتے جنہوں نے ہمیں اس جہنم سے نکلنے میں مدد دی تھی۔ یہ جذبات آنسو بن کر آنکھوں میں آ گئے۔ ہم نے دل ہی دل میں ان کا بھی شکریہ ادا کیا جنہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ وہ مجبور تھے، ہماری مالی معاونت کرنے کے قابل نہیں تھے لیکن ان کی ہمدردیوں نے ہمیں جو روحانی سہارا دیا وہ بہت قیمتی تھا۔

نیپال کے مسلمان
ستر میل پیدل سفر

رہائی کی مسرت نے ہمیں پاگل پن کی حد تک پہنچا دیا۔ آپ بھی ہمیں پاگل کہیں گے یا ہماری وہ حرکتیں کم از کم ناپسند ضرور کریں گے جو ہم نے نیپال میں داخل ہو کر کیں۔ ہم نے ہندوستان کی طرف منہ کر کے پیشاب کیا، نفرت سے تھوکا اور کچھ اور بیہودہ حرکتیں کیں۔ ہمیں اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ یہ نفرت کی انتہا اور خوشی کے جذبات کی شدت تھی۔ میں آج اپنی ان حرکتوں کو یاد کرتا ہوں تو اپنے آپ میں شرمسار سا ہو جاتا ہوں۔

ان بیہودہ حرکتوں سے فتح کی خوشی منا کر ہم نیپال کے ایک قصبے میں جا پہنچے۔ نیپال اور ہندوستان کی اس سرحد کے ساتھ دو طرف مسلمان باشندوں کی اکثریت ہے اور وہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ ہمارے پاس لکھنؤ والے

بزرگ محسن کا دیا ہُوا ایک خط تھا جو اس قصبے میں ایک صاحب کو دینا تھا۔ ہم دیئے ہوئے ایڈریس کے مطابق ان تک پہنچ گئے۔ وہ نیپال کے متمول مسلمانوں میں سے ہیں۔ ہم نے انہیں خط دیا تو پڑھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ وہ تو پاکستان کے عاشق تھے۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں ان کا داخلہ ممنوع ہے، کیونکہ انہیں پاکستان کا ایجنٹ سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ پاکستان کے ایجنٹ ہیں یا نہیں، البتہ پاکستان کے ایسے شیدائی ہیں کہ ان پر پاکستان کا ایجنٹ ہونے کا شک کیا جا سکتا ہے۔

کھانے کے بعد میرا جسم اکڑنے لگا اور جسم کے اندر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ہلکا ہلکا بخار ہو گیا۔ ہمارے میزبان کو پتہ چلا تو اس نے اپنے نوکر کو بھیج کر دوائی منگوالی۔ . . . . . یہ علاقہ پسماندہ ہے۔ وہاں سے کھٹمنڈو تک کوئی سواری نہیں ملتی اور کوئی باقاعدہ سڑک بھی نہیں ہمیں کھٹمنڈو پہنچنا تھا، کیونکہ نیپال کا دارالحکومت یہی ہے، اور پاکستانی سفارتخانہ بھی وہیں ہے، مگر وہاں تک پہنچنا بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ ہمیں پہلے بھیروا جانا تھا۔ وہاں سے کھٹمنڈو تک چھوٹے طیارے سے جانا تھا۔ ہم جہاں رُکے ہوئے تھے، وہاں سے بھیروا ستر (۷۰) میل دور ہے اور سواری ناپید۔

ہمارے میزبان نے پیش کش کی کہ ہم تین چار روز انتظار کریں تو وہ ہاتھی کا انتظام کر دیں گے، لیکن ہم ان کے لئے زحمت کا باعث نہیں بننا چاہتے تھے۔ ہم نے بھیروا تک کا سفر ستر میل پیدل طے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے پاس جو ہندوستانی روپے بچ گئے تھے وہ نیپالی کرنسی سے تبدیل کرائے۔ اس طرح ہمارے پاس ۷۰ نیپالی روپے ہو گئے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء کی صبح رات کی پُرسکون نیند کے بعد آنکھ کھلی تو دھوپ چمک رہی تھی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ ہمارے میزبان نے ہمیں راستے کے لئے چند ایک چیزیں دے دیں اور ہم جذبات کے غلبے میں جدا ہوئے۔ وہاں کوئی سڑک یا راستہ نہیں تھا۔ ہم دھان کے کھیتوں

کی پگڈنڈیوں پر چلے جا رہے تھے۔ کچھ دور گئے تو ایک نیپالی نوجوان ہم سے آملا۔ تعارف ہُوا تو ہم نے اسے بتایا کہ ہم سیّاح ہیں اور نیپال کے دیہاتی علاقے دیکھتے پھر رہے ہیں۔ وُہ ہم میں گھل مل گیا اور کچھ دور تک ہمارے ساتھ گیا۔ اس کا گاؤں آگیا۔ اس نے ہمیں اپنے گاؤں چلنے کی دعوت دی، لیکن ہم رکنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا شکریہ ادا کر کے چلتے گئے۔ ہمارے سامنے بڑی لمبی مسافت تھی۔

بہت دور تک نکل گئے۔ کوئی اور گاؤں نظر نہ آیا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ پانی کا نام و نشان نہ تھا نہ کوئی گاؤں نظر آتا تھا...... آخر ایک گاؤں دکھائی دیا۔ وہاں گئے تو کوئی انسان نظر نہ آیا۔ میں نے ایک جھونپڑے کے اندر جھانکا تو اندر سے ایک نوجوان لڑکی نکلی اور بھاگ گئی۔ وہ ہم سے ڈر گئی تھی۔ معاً بعد ایک ادھیڑ عمر عورت آگئی۔ میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ پانی پئیں گے۔ اس نے پانی پلا دیا۔ لڑکی واپس آگئی اور ہمارے پاس کھڑی ہو گئی۔ ہم پھر چل پڑے۔

دن بھر کی پا پیادہ مسافت ہمیں ایک قصبے میں لے گئی جو تحصیل ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک ہوٹل سے دودھ اور جلیبیاں کھائیں۔ رات گذارنے کا مسئلہ اس طرح حل کیا کہ چھوٹی سی ایک مسجد میں چلے گئے اور پیش امام کو بتایا کہ ہم پاکستان کے مسافر ہیں اور رات مسجد میں گذارنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے اجازت دے دی۔ ہم نے غسل کیا، عشاء کی نماز پڑھی اور اس کے بعد کھانا جو آنا شروع ہُوا تو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ نہ جانے کتنے مسلمان بھائی گھروں سے کھانا لے آئے۔ اس میں سے ہم ایک چوتھائی بھی نہ کھا سکے۔ لوگ ہمارے اردگرد جمع ہو گئے اور پاکستان کی باتیں پوچھنے لگے۔ وہ ہماری سنتے رہے اور اپنی سناتے رہے۔ مسجد سے ملحق مدرسہ تھا۔ اس کے برآمدے میں ہمارے لئے ایک بڑے تخت پر گدے بچھا دیئے گئے، اور جب ہمارے تمام میزبان رخصت ہو گئے تو ہم سو گئے۔

اس پُراسرار اور صبر آزما سفر کے دوران جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اسلام کا جذبۂ اخوّت تھا۔ لکھنؤ کا کوئی متمول اور تہذیب یافتہ ہو یا نیپال کے پسماندہ علاقے کا نادار مسلمان، مسجد کا پیش امام ہو یا سائیکل رکشا چلانے والا نوجوان، ہم نے سب میں ایک ہی جذبہ دیکھا۔ اخوّت اور ایثار میں سب ایک جیسے تھے۔ یہ اسلام کی عظمت ہے۔

فجر کی نماز کے بعد ہم اپنے ان محسنوں اور میزبانوں سے رخصت ہوئے اور سفر کے اگلے مرحلے میں داخل ہو گئے۔ سارا دن چلتے رہے۔ تھکن نے توڑ دیا۔ شام ہونے کو تھی۔ جب ہمیں ایک گاؤں کی مسجد نظر آنے لگی۔ ہم سیدھے مسجد میں گئے۔ وہاں ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اسے بتایا گیا کہ ہم رات مسجد میں گذارنا چاہتے ہیں تو وہ پیش امام کو بلا لایا۔ ان کے ساتھ گاؤں کے بڑے زمیندار کی یہ اطلاع بھی آ گئی کہ ہم رات کا کھانا اس کے گھر کھائیں۔ یہ رات بھی نہایت اچھی گذر گئی۔

۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء کی صبح ہم بھیروا کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں مہاتما بدھ کے دَور کے مندر دیکھے، اور اندر جا کر پرانی تحریریں اور مہاتما بدھ کی مورتیاں دیکھیں۔ اور آگے چل پڑے۔ وہاں پتہ چلا کہ بھیروا صرف دس بارہ میل دور رہ گیا ہے۔ اس خبر نے ساری تھکن دور کر دی۔ دس بارہ میل کوئی فاصلہ ہی نہیں تھا۔ چائے کی چھوٹی سی ایک دکان نظر آئی جس کی مالکہ ایک عورت تھی۔ اس سے چائے لے کر پی۔ دیکھا کہ وہاں حلوہ پڑا تھا۔ وہ بھی لے کے کھایا۔ اس دوران ایک نوجوان ملا۔ اسے بھی ہم نے بتایا کہ ہم سیاح ہیں اور بھیروا جا رہے ہیں، وہاں سے کٹھمنڈو جائیں گے۔ اس نے بتایا کہ راستے میں آخری دریا رہ گیا ہے۔ یہ دراصل دریا نہیں وسیع نالہ تھا۔ اس سے پہلے بھی ہم نے چند ایک ندی نالے عبور کئے تھے۔

اس دریا پر پہنچے تو وہاں بہت رونق دیکھی۔ اس کے ایک کنارے پر گاؤں تھا۔ وہاں کے بچے، جوان، مرد اور عورتیں دریا میں نہا رہی تھیں۔ کچھ عورتیں کپڑے

دھو رہی تھیں۔ ہم نے ذرا پرے جا کر کپڑے اتارے اور انہیں دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیا۔ شیو کی اور دریا میں نہائے۔ ہم نے پاجامے ہینڈ بیگ میں رکھ لئے اور کاٹن کی وہ پتلونیں پہن لیں جو دلّی میں خریدی تھیں۔ تقریباً دو بجے دریا پار کر کے بھیروا کو روانہ ہوئے۔

شام سے بہت پہلے ہمیں بھیروا کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ سب سے پہلے جو عمارت نظر آئی وہ ہوائی اڈے کی تھی۔ فیکٹریوں کی چمنیاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ ہم چلتے گئے اور شہر میں داخل ہوئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہم ایک مسجد میں چلے گئے اور پیش امام سے اپنا تعارف کرا کے رات مسجد میں رہنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے خلوص اور مسرت سے اجازت دے دی۔ مسجد میں کئی نمازی آ چکے تھے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو ان میں سے ہر ایک ہمیں کھانے کے لئے اپنے گھر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر انہوں نے ہمیں تقسیم کر لیا۔ تین آدمی ہم تینوں کو الگ الگ کر کے اپنے اپنے گھروں کو لے گئے۔ ہمیں یوں تقسیم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگ بہت غریب تھے۔ ان میں سے کوئی بھی تین مہمانوں کو کھانا کھلانے کے قابل نہیں تھا۔ وہ روٹی کپڑے کے لحاظ سے تو غریب تھے لیکن ایثار و اخوّت اور میزبانی کے جذبے سے مالا مال تھے۔ ہمارے لئے یہ اہم نہیں تھا کہ انہوں نے ہمیں کیا کھلایا بلکہ یہ کہ کس طرح کھلایا۔ یہی ان کی عظمت تھی۔ ہندوستان کے آخری قصبے میں ہمیں مرغن کھانے کھلائے گئے تھے مگر جو لطف بھیروا کے مسلمانوں کے نہایت سادہ کھانے میں ملا وہ روح میں اُتر گیا۔

عشاء کی نماز کے بعد ہم مسجد میں ہی سوئے مگر مچھروں نے ایسی یلغار کی کہ سونا حرام ہو گیا۔ چادریں اوڑھنے کے باوجود مچھروں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ہم باہر جا لیٹے تو وہاں بھی مچھر آ گئے۔ باقی رات مچھروں سے لڑتے جھگڑتے گذر گئی۔ صبح بھیروا کے ہوائی اڈے پر گئے۔ کٹھمنڈو تک ہوائی جہاز کا کرایہ معلوم کیا تو بتایا گیا ایک سو سترہ روپے فی کس۔ ہمارے پاس کُل باسٹھ روپے تھے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم میں سے ایک آدمی کھٹمنڈو جائے، پاکستانی سفارت خانے میں جا کر باقی دو کے لئے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھجوائے۔ یہی صورت تھی۔ بذریعہ سڑک جانا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ بارشوں کی وجہ سے راستے میں دو تین پل ٹوٹ گئے تھے۔

ہم نے وہاں کے مسلمانوں سے کچھ رقم لے کر اُسے باسٹھ روپوں میں جمع کیا اور میجر نادر پرویز کے لئے اگلے روز کی فلائٹ میں سیٹ بک کرا لی۔ وہ رات بھر مسجد میں گزاری۔ صبح ایک بڑا ہی غریب آدمی ہم تینوں کو اپنے گھر ناشتے کیلئے لے گیا۔ اس ناشتے میں بھی خلوص کی چاشنی اور اسلامی اخوت کی شیرینی تھی۔ آج وہ میزبان یاد آتے ہیں تو جذبات رِقت طاری کر دیتے ہیں۔

وہاں سے ہم ہوائی اڈے پر گئے۔ معلوم ہوا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائٹ منسوخ ہو گئی ہے۔ موسم کوئی ایسا خراب تو نہیں تھا، لیکن بھیروا سے کھٹمنڈو تک چھوٹے ہوائی جہاز چلتے ہیں، جن کے لئے موسم کی معمولی سی خرابی بھی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ انہیں بلند پہاڑوں کے درمیان پرواز کرنی پڑتی ہے۔ ہوائی اڈے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگلی پرواز کا کچھ پتہ نہیں کب جائے۔

ہم نے ٹکٹ واپس کر کے پیسے لے لئے۔ وہیں کسی نے بتایا کہ ایک موٹر گاڑی کٹھمنڈو جا رہی ہے۔ ہم دوڑے گئے۔ واقعی ایک گاڑی جا رہی تھی۔ ہم نے میجر نادر کو اس میں سوار کر کے رخصت کر دیا اور شہر جا کر دوپہر کا کھانا کھایا۔

مغرب کی نماز سے ذرا پہلے میں اور طارق مسجد میں چلے گئے۔ رات وہیں گذارنی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد ایک مسلمان کھانے کے لئے ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ واپس مسجد میں گئے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو بتایا گیا کہ ہمارے لئے باہر ایک چارپائی بچھا دی گئی ہے۔ باہر جا کے دیکھا تو وہاں ایک چارپائی بچھی تھی۔ ہمارے میزبانوں نے شاید گذشتہ رات محسوس کر لیا تھا کہ مچھروں نے ہمیں رات بھر پریشان رکھا ہے۔ ہم دونو ایک ہی مچھردانی میں گھس گئے اور رات بڑے آرام سے گذری۔ صبح کسی نے بتایا کہ جس نے ہمیں مچھردانی دی تھی

اس کے پاس یہی ایک مچھردانی تھی۔ ہم خوب اندازہ کر سکتے تھے کہ ہمارے آرام کی خاطر اس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ وہ رات بھر مچھروں کے حملوں میں تڑپتا رہا ہوگا۔

اگلا سارا دن ہم نے مسجد میں گذارا۔ میلے کپڑے بھی دھوئے۔ اس سے اگلے روز ہم ہوائی اڈے پر یہ معلوم کرنے کے لئے گئے کہ کھٹمنڈو سے ہمارے ٹکٹ آئے ہیں یا نہیں۔ پتہ چلا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے تمام پروازیں منسوخ ہو گئی ہیں لہٰذا ٹکٹوں کی امید بھی ختم ہو گئی۔ شام کو مسجد میں چلے گئے۔ رات وہیں گذاری اور اگلی صبح پھر ہوائی اڈے پر جا دھمکے۔ موسم پرواز کے قابل ہو گیا تھا۔ دو پروازیں آ چکی تھیں۔ ہم نے کاؤنٹر پر جا کر کلرک سے اپنے ٹکٹوں کے متعلق پوچھا۔ ٹکٹ نہیں آئے تھے۔ ہم نے کئی بار اس کلرک سے پوچھا اور ہر بار جواب نفی میں ملا۔ ہوائی اڈے پر سیاحوں کا ہجوم تھا۔

اعلان ہوا کہ کچھ دیر تک کھٹمنڈو سے ایک پرواز آ رہی ہے، جو کسی اور شہر جائے گی اور وہاں سے پھر بھیروا آئے گی، اور فوراً بعد کھٹمنڈو چلی جائے گی۔ اب ہماری امیدیں اس پرواز کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ کچھ انتظار کے بعد ہوائی جہاز آ گیا۔ اس کے رکنے کی دیر تھی کہ میں اور طارق اس میں گھس گئے۔ پائلٹ اور ایئر ہوسٹس سے پوچھا کہ وہ ہمارے ٹکٹ لائے ہیں یا نہیں۔ دونو نے نفی میں سر ہلا دیئے۔ ہم پھر کاؤنٹر پر گئے۔ وہاں سے بھی ایسا ہی جواب ملا...... ہم وہاں سے مایوس ہو کر واپس ہوئے ہی تھے کہ کلرک نے ہمیں آواز دی اور یہ مژدہ سنایا کہ ہمارے ٹکٹ آ گئے ہیں۔

میں نے میجر طارق سے کہا کہ وہ ٹکٹ لے لیں اور خود سامان لانے کے لئے ایک رکشا لے کر مسجد میں چلا گیا۔ جلدی جلدی پیش امام کا شکریہ ادا کیا اور بھاگم بھاگ ہوائی اڈے پر پہنچا۔ ہمیں کھٹمنڈو لے جانے والا ہوائی جہاز کسی اور شہر چلا گیا تھا، جہاں سے اسے بھیروا واپس آنا تھا۔ اسے واپس آنے میں زیادہ دیر نہ

لگی۔ خدائے ذوالجلال نے ہمیں وہ وقت دکھایا کہ ہم ہوائی جہاز میں بیٹھے، ہوائی جہاز اُڑا اور کھٹمنڈو جا کر اترا۔ ہم نے ٹیکسی لی، اور پاکستانی سفارت خانے میں گئے۔ وہاں ہمارا پُر جوش استقبال کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ میجر نادر کو بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان روانہ کر دیا گیا ہے۔ ہمارا فوری طور پر جانا ممکن نہ تھا۔ سفارت خانے نے ہمیں خاصی رقم دے دی۔

ہم نے ایک بڑے اچھے ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ بازار سے اچھے کپڑے بھی خریدے اور رات کو بہت ہی گہری نیند سوئے۔ اب ہم دو فٹ چوڑی سرنگ میں رینگنے اور ہندوستانیوں سے بچے رہنے کی کوشش کرنے والے کیڑے مکوڑے نہیں تھے۔ ہم ہندوستان میں مجرموں کی طرح چھپ چھپ کر چلنے والے مشتبہ انسان بھی نہیں تھے۔ اعصاب سے تمام ناگوار بوجھ اتر گیا تھا۔ اُن دوستوں کی یاد تلخی پیدا کرتی تھی، جو کیمپ میں رہ گئے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ سرنگ سے ہمارے کسی اور دوست نے فائدہ اٹھایا تھا یا نہیں۔

اگلے روز ہم سفارت خانے میں گئے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہمیں چند دن وہیں رکنا پڑے گا، کیونکہ تمام فضائی کمپنیوں کے ہوائی جہاز بنکاک اور کلکتہ سے ہو کر جا رہے تھے۔ سفارتخانہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ ہمارے ہوائی جہاز کا کلکتہ میں اترنا ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا تھا، چنانچہ ہم کھٹمنڈو میں ہی رُکے رہے۔

وہاں ہم نے مشرقی پاکستان سے آنے والے پاکستانیوں کو بہت بُری حالت میں دیکھا۔ یہ بد نصیب کسی نہ کسی طور مشرقی پاکستان کے محشر سے نکل آئے تھے اور نیپال جا پہنچے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پاکستانی ہونا ایک عذاب ہے۔ مشرقی پاکستان میں باعزت زندگی گذارنے والے، کوٹھیوں میں رہنے والے، اونچی حیثیت کے لوگ کھٹمنڈو میں فٹ پاتھوں پر پڑے تھے۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ ان کی قسمت میں ابھی کتنی کچھ ذلت و خواری لکھی ہے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کی مبارک صبح طلوع ہوئی۔ پاکستان جانے کے لئے "رائل نیپال

ایئر لائینز" کے ہوائی جہاز میں ہماری سیٹیں بک کرا دی گئی تھیں۔ یہ واحد فضائی کمپنی تھی جس کے ہوائی جہاز کلکتہ نہیں اترتے تھے۔ ہم ایئر پورٹ پہنچے۔ ہوائی جہاز میں بیٹھے اور ذرا دیر بعد ہم فضا میں تھے، لیکن ذہنی طور پر ہماری بلندی ہوائی جہاز سے بہت زیادہ تھی۔ ہم کہکشاں میں جا پہنچے تھے...... ہوائی جہاز بنکاک ایئر پورٹ پر اُترا۔ ہماری چیکنگ کے بعد ہمیں ایک ہوٹل میں پہنچا دیا گیا۔ جس کا انتظام پی۔ آئی۔ اے نے کیا تھا۔ یہاں سے کراچی تک ہمیں اپنی فضائی سروس، پی۔ آئی۔ اے کے ہوائی جہاز میں سفر کرنا تھا۔ ہم نے ہوٹل میں کھانا کھایا اور سو گئے۔

اگلی صبح پاک فوج کے بریگیڈیئر مجیب جو سیٹو میں پاکستان کے فوجی مشیر تھے ہمیں لینے کے لئے آ گئے۔ انہوں نے اپنی کار میں ہمیں بنکاک کی سیر کرائی ہمیں کچھ پیسے بھی دیئے جن سے ہم نے اپنے لئے چند ایک چیزیں خریدیں۔ وہ ہمیں بنکاک میں پاکستانی سفارت خانے میں بھی لے گئے اور پاکستانی سفیر سے ملاقات کرائی۔ اب ہم جہاں جاتے تھے وہاں بڑے ہی فخر سے بتاتے تھے کہ ہم اتنی لمبی سرنگ کھود کر جنگی قیدی کیمپ سے فرار ہوئے ہیں۔ ہمیں ہر جگہ "ہیرو ویلکم" دیا گیا۔ ہمیں چھ بجے ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔

شام کو ایئر پورٹ پہنچے۔ پی۔ آئی۔ اے کا ہوائی جہاز تیار تھا۔ ہم سوار ہوئے اور ایک بار پھر فضا میں پہنچ گئے۔ ہوائی جہاز کا رخ کراچی کی طرف ہوا اور وہ مطلوبہ بلندی پر چلا گیا تو ایئر ہوسٹس نے ہمیں بتایا کہ ہم دونوں کو ہوائی جہاز کا کیپٹن (پائلٹ) بلا رہا ہے۔ ہم وجہ نہ معلوم کر سکے۔ ہم گئے تو معلوم ہوا کہ پائلٹ کو ہمارے متعلق معلوم ہو گیا تھا کہ ہم فرار ہو کر آئے ہیں۔ وہ ہم سے فرار کی روئیداد سننا چاہتا تھا، جو ہم سنانے لگے ہیں تو تین گھنٹے یعنی پرواز کا آدھا وقت پائلٹ کے پاس ہی گذر گیا۔

اور ہم کراچی ایئر پورٹ پر اترے۔ پاک فوج کا ایک کیپٹن ہمارے استقبال کیلئے ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ وہ آرام کے لئے ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ صبح ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء پھر ایئر پورٹ گئے۔ اب ہماری منزل اسلام آباد تھی۔ پی۔ آئی۔ اے کے ایک

ہوائی جہاز نے دس بجے اسلام آباد پہنچا دیا، جہاں ہمارے استقبال کے لئے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اپنی انٹیلی جنس کے افسر بھی تھے۔ وہ اپنا فرض نبھانے کے لئے ہمیں جی۔ ایچ کیو لے گئے۔ کچھ سرکاری مراحل طے کرنے میں چند دن وہیں گزرے اور ہمیں دو ماہ کی رخصت دے کر گھروں کو بھیج دیا گیا۔

رخصت پر جانے سے پہلے راولپنڈی ٹیلی ویژن سے ہمارا انٹرویو نشر کیا گیا جو ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔

آج میں اپنی فوج میں ہوں، اپنے پیارے پاکستان میں ہوں، اپنے عزیزوں میں ہوں، مگر میں اُن مسلمانوں کو نہیں بھول سکتا جنہوں نے ہمیں ہندوستان سے نکلنے میں مدد دی۔ میں قیدی کیمپ کو بھول جاؤں گا، سرنگ کو بھی شاید بھول جاؤں مگر ہندوستان کے اُن مسلمانوں کو کسی لمحہ نہیں بھول سکوں گا جو ایسے کٹھن سفر میں خضرِ راہ اور مددگار بنے۔ اللہ انہیں جزا دے۔ آمین۔

کبریا کی کمر ٹوٹ گئی

اس روئیداد کو میں اپنے ایک ساتھی، کیپٹن غلام کبریا کے ذکر کے بغیر نامکمل سمجھتا ہوں۔ کیپٹن کبریا فرار کے ہر مرحلے میں ہمارے ساتھ رہا۔ پلاننگ میں بھی ساتھ تھا اور سُرنگ کی کھدائی میں بھی، مگر اُس کی قسمت میں قید ہی لکھی تھی۔ ہُوا یوں کہ سُرنگ تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ ایک روز کیپٹن کبریا سُرنگ کی کھدائی میں ہی مصروف تھا کہ اُس کی کمر کو شدید جھٹکا لگا۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو گیا کہ اُس کے لیے اُٹھ کر چلنا ناممکن ہو گیا۔ درد ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ بڑی جدوجہد سے سُرنگ سے نکلا۔ تکلیف نے اُسے ایسا بے بس کیا کہ اُسے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ پندرہ بیس روز بعد ہسپتال سے واپس آ گیا لیکن وہ ٹھیک نہیں ہُوا تھا۔ اُس نے فرار کے ارادے کے پیشِ نظر ہسپتال والوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔

یہ اُس کی قوتِ ارادی کا مظاہرہ تھا، ورنہ چلنا پھرنا تو دُور کی بات ہے وہ ہلنے جُلنے کے بھی قابل نہیں تھا۔

سُرنگ مکمل ہو گئی اور فرار کی رات آ گئی مگر کیپٹن غلام کبریا چارپائی سے اُٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ہم نے اُس کی خاطر فرار ملتوی کر دیا۔ امید تھی کہ وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ یہ ہماری خوش فہمی تھی۔ کیپٹن کبریا نے ہمیں کہا کہ ہم اس کا انتظار نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ سُرنگ پکڑی جائے۔ ہم اپنے اُس ساتھی کو پیچھے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے جس کا خون اور پسینہ اِس سُرنگ میں شامل تھا۔ اُس کی کمر فی الواقع اس سُرنگ نے توڑ ڈالی تھی۔ اگر فرار کا مرحلہ اسی قدر ہوتا کہ سُرنگ سے نکلتے ہی ہم خطروں سے آزاد ہو جاتے تو ہم کیپٹن کبریا کو کندھوں پہ اُٹھا کر لے جاتے لیکن فرار کی اصل دشواریاں اور خطرے تو سُرنگ سے باہر تھے۔ سُرنگ کے باہر جسمانی صحت کا سو فیصد صحیح ہونا اور ذہن کا مکمل طور پہ بیدار رہنا اشد ضروری تھا۔ کیپٹن کبریا اس قابل نہیں تھا۔

اُس نے اصرار کیا کہ ہم نکل جائیں اور اُس کی خاطر فرار کا اتنا بڑا پلان جو عملی شکل میں آ گیا ہے تباہ نہ کریں۔ اُس کے دلائل پُر مغز تھے مگر ہمارے جذبات کی کیفیت کچھ اور تھی۔ ہم نے آخر حقیقت کو قبول کر لیا اور بڑے ہی بوجھل دل اور زخم خوردہ جذبات سے کیپٹن غلام کبریا سے رخصت ہوئے۔ پاکستان میں اُس سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب تندرست ہے لیکن درد ابھی کچھ باقی ہے۔

سب کیوں فرار نہ ہُوئے؟

اِس قیدی کیمپ کے تمام افسر ہمارے منصوبے میں شامل تھے لیکن سب نے سُرنگ سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اس کی کچھ وجوہات تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ ہمارے بہت سے افسروں نے سوچا تھا کہ کم سے کم تعداد میں افسر نکل جائیں

تو انہیں آسانی سے پکڑا نہیں جا سکتا۔ اگر ایک ہی بار پچاس ساٹھ قیدی نکل جائیں تو انہیں پکڑنے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ وہ ہجوم کی صورت میں نکلتے اور ہجوم کی صورت میں ہی کچھ دیر تک یا کچھ دُور تک جاتے ہیں۔ اجتماعی فرار MASS ESCAPE کا سراغ کیمپ میں بھی فوراً مل جاتا ہے۔ مثلاً رات کو پُوری کی پُوری بارک خالی ہو جائے تو رات کو ہی پتہ چل جاتا ہے۔

یہ ہمارے اُن ساتھی افسروں کے جذبۂ ایثار کا مظاہرہ تھا جو فرار نہ ہوئے اور ہمیں نکلنے میں مدد دی۔ نفسیاتی پہلو سے دیکھئے تو اُن کا فرار نہ ہونا پختہ کردار کا پتہ دیتا ہے۔ فرار ہونے کے لیے بڑے مضبوط دل اور فولاد جیسے عزم کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن سُرنگ موجود ہو تو اس کے دہانے پہ کھڑے ہو کر جو کہے کہ وہ فرار نہیں ہوگا، اُس کے دل اور کردار کی پختگی کا ثبوت ہے۔ ہمارے ساتھیوں نے اس خیال سے کہ ہم پکڑے نہ جائیں ہمارے ساتھ نہ نکلے اور قید میں پڑے رہے۔ انھوں نے ہمارے لیے قربانی دی۔

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم پانچوں نے چونکہ جنگی قیدی بنتے ہی ارادہ کر لیا تھا کہ فرار ہوں گے، گاڑی سے ہوں یا کیمپ سے، اس لیے ہم نے کپڑوں کا ایک ایک جوڑا چھپا لیا تھا تاکہ ان پر قیدی کیمپ کا نشان نہ لگ سکے۔ اس کے علاوہ ہم نے ہندوستانی کرنسی کا بھی انتظام کر کے کرنسی چھُپا کر رکھ لی تھی۔ باقی افسروں کے پاس ایسے انتظامات نہیں تھے۔

قیدی کیمپ کے تمام افسروں نے ہمیں جذباتی سہارا دیا اور ہر مرحلے میں ہماری حوصلہ افزائی کی یہ قدرتی امر ہے کہ جذباتی سہارا نہ ہو تو عمل میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوتی۔ ہمیں تمام افسروں نے خود اعتمادی دی۔ مَیں اور میرے چاروں ساتھی جو فرار ہوئے تھے ان سب کے تاعمر ممنون رہیں گے۔

مَیں اُن افسروں کے نام اس تاریخی ریکارڈ میں لانا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے ہمیں عملی مدد دی اور ہمارے منصوبے کو کامیابی عطا کی۔ ان کے

نام درج ذیل ہیں۔ مَیں معذرت خواہ ہوں کہ مجھے ان کے موجودہ عہدوں کا علم نہیں اس لیے پُرانے عہدے لکھ رہا ہوں:

کیپٹن آفاض	انجنیرز
کیپٹن رضوان	انجنیرز
کیپٹن شاہد	پنجاب رجمنٹ
کیپٹن جمیل	پنجاب رجمنٹ
کیپٹن بشیر احمد سلیمی	پنجاب رجمنٹ
کیپٹن شوکت باجوہ	پنجاب رجمنٹ
سکنڈ لیفٹیننٹ شوکت	پنجاب رجمنٹ
لیفٹیننٹ طارق گوندل	پنجاب رجمنٹ
کیپٹن اشرف	آزاد کشمیر فورسز
کیپٹن یوسف	آرٹلری
سکنڈ لیفٹیننٹ اعجاز احمد	آرٹلری

معذرت

مَیں نے یہ روئیداد فرار کے تین سال بعد قلمبند کی تھی۔ تفصیلات ذہن میں محفوظ تھیں۔ اتنی طویل داستان سُناتے متعدد جُزدی واقعات رہ گئے ہوں گے۔ بعض ایسے حضرات کے نام بھی رہ گئے ہوں گے جو میدانِ جنگ میں ہمارے ساتھ تھے اور فرار اور سُرنگ کے بھی کسی نہ کسی مرحلے میں ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اگر مَیں واقعات کی ترتیب میں کوئی بھول چُوک کر گیا ہوں یا کسی کا نام اِس داستان میں لانا بھول گیا ہوں تو براہِ کرم میری معذرت قبول فرمائیے گا۔ مَیں نے کسی کو دانستہ نظرانداز نہیں کیا۔

باقی دو کی داستان

میجر نادر پرویز، میجر طارق پرویز اور کیپٹن نور احمد سُرنگ سے نکل گئے تو ایک گھنٹہ بعد اس سُرنگ سے کیپٹن ظفر حُسین گِل اور لیفٹیننٹ یٰسین نکلے۔ اوّل الذکر تین کی روئیداد آپ نے پڑھ لی، اب مؤخر الذکر دو کی داستان پڑھیے۔ یہ میں نے دسمبر ۱۹۷۲ میں قلمبند کی اور "حکایت" میں شائع کی تھی۔

عنایت اللہ

۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کی صبح بھارت کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی تھی!

پانچ پاکستانی جنگی قیدی فرار ہو گئے

"فتح گڑھ ۱۰ ستمبر: پانچ پاکستانی جنگی قیدی جو سب افسر ہیں گذشتہ رات قیدی کیمپ سے فرار ہو گئے ہیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر مہندر سنگھ نے کہا ہے کہ بھاگنے والوں کو جن میں دو میجر، دو لیفٹیننٹ اور ایک کیپٹن ہے، پکڑنے کیلئے پولیس نے زبردست مہم شروع کر دی ہے۔"

پاک فوج کے یہ پانچ افسر بھارت کے قیدی کیمپ نمبر ۴۵ سے فرار ہوئے تھے جو یو پی کی چھاؤنی فتح گڑھ میں تھا۔ یہ پانچوں افسر بڑی ہی صبر آزما مسافت طے کر کے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ میجر نادر پرویز ستارۂ جرأت۔ ان کے چچازاد بھائی میجر طارق پرویز۔ کیپٹن ظفر حسین گل، کیپٹن (اس وقت لیفٹیننٹ) نور احمد اور لیفٹیننٹ یٰسین جس وقت بھارت کے لوگ فرار کی یہ خبر پڑھ رہے تھے اس وقت ہمارے یہ پانچ جانباز انہی لوگوں میں گھوم پھر رہے تھے اور پھر انہی لوگوں کے ساتھ انہوں نے اپنے فرار کی خبر پڑھی۔

دشمن کی قید سے فرار کی کوشش دوسرے لفظوں میں خودکشی کی کوشش ہوتی ہے۔ کیمپ کے سنتری دیکھ لیں تو گولی مار دیتے ہیں اور اگر پکڑے جائیں تو دشمن غیر انسانی اذیتیں دیتا اور بھوکا پیاسا مار دیتا ہے۔ یہ موت بڑی ہی اذیت ناک ہوتی ہے، اور اگر موت نہ آئے تو یہ زندگی جہنم سے بدتر ہوتی ہے۔ انسان مرنے کی دعائیں کرتا ہے۔ اس

سزا سے کوئی مر جاتا ہے تو مرتا رہے، دشمن کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ مسلمان کو تڑپا تڑپا کر مارنے سے ہندو کو لذت ملتی ہے۔ اس حشر سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے مجاہدوں نے فرار کی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعض ناکام ہوئے، کچھ نکل آئے۔ ان کوششوں کے پس منظر میں صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ ہندو کی قید میں نہیں رہیں گے۔ اگر انہیں آخری دم تک لڑنے دیا ہوتا اور انہوں نے مار کر ہتھیار ڈالے ہوتے تو قیدی کیمپوں میں ان کا رویہ کچھ اور ہوتا، مگر یہاں صورت یہ پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ ابھی لڑ رہے تھے اور آخری دم تک لڑنے کا عزم کئے ہوئے تھے کہ انہیں ہتھیار ڈالنے کا حکم دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے قیدی کیمپوں میں آ کر ایک اور جنگ شروع کر دی اور ہندو پر ثابت کر دیا کہ تم فاتح نہیں ہو۔

ان پانچ افسروں کے کامیاب فرار کی کہانی سنانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جس طرح یہ لوگ لڑے اور جس طرح ان سے ہتھیار ڈلوائے گئے اس کی ایک جھلک دکھا دی جائے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مشرقی محاذ سے وہ کونسی آگ سینے میں دبائے بھارت کے قیدی کیمپوں میں گئے اور وہاں سے کیسی کیسی چنگاریاں لے کے آئے ہیں۔ سلہٹ کی سرحد پر اپنی صرف دو پلٹنیں تھیں۔ کرنل ریاض کی زیر کمان اکتیس پنجاب رجمنٹ اور کرنل مختار کی زیر کمان تیس فرنٹیئر فورس اور ملیشیا کے بھی کچھ ٹروپس تھے جو نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان کے ساتھ صرف ایک توپخانہ رجمنٹ (اکتیس فیلڈ) تھی جس کے کمانڈر کرنل خالد صفدر چوہدری تھے۔ اس مختصر سی فورس کے کمانڈر بریگیڈیئر سلیم اللہ تھے۔ ان کی ذمہ داری میں ستر میل لمبا فرنٹ تھا جو دو پلٹنوں اور ایک توپخانہ رجمنٹ کی استطاعت سے بہت ہی زیادہ تھا۔ تھا وسیع فرنٹ کم از کم ایک ڈویژن کو دیا جاتا ہے۔ ستر میل میں دو پلٹنیں سیکشنوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسری سے دور دور پھیل گئی تھیں اور ایک توپخانہ رجمنٹ کی توپیں اس طرح تقسیم ہو گئی تھیں کہ کسی پوزیشن میں دو تھیں، کسی میں تین اور صرف ایک پوزیشن ایسی تھی جس کی سپورٹ کے لئے چار توپیں تھیں۔

اکتوبر ۱۹۷۱ء کے آخر میں دشمن نے سلہٹ کی شمال مغربی سرحد پر پورے بریگیڈ سے حملہ کر دیا۔ اس بریگیڈ کو بھارت کی پوری توپخانہ رجمنٹ امدادی گولہ باری دے رہی تھی۔

اس بریگیڈ کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی نفری پوری بٹالین جتنی بھی نہیں تھی، اور توپخانہ رجمنٹ کے مقابلے میں صرف چار توپیں تھیں۔ ان کا او پی کیپٹن ظفر حسین گل تھا۔ ہماری اس مختصر سی نفری نے جم کر مقابلہ کیا اور نہ صرف حملہ پسپا کر دیا بلکہ دشمن کا جانی نقصان بھی کیا اور بے شمار جنگی قیدی بنائے۔ ان سے معلوم ہوا کہ اس بریگیڈ میں ایسٹ بنگال رجمنٹیں تھیں جو پاک فوج سے بھاگ گئی تھیں۔ ایسٹ پاکستان رائفلز کے آدمی بھی تھے۔ بنگالی شہری بھی تھے۔ انہیں بھارت میں فوجی ٹریننگ دی گئی تھی۔ ان سب کا کمانڈر میجر مشرف تھا جو مغربی پاکستان میں پاک فوج کے ایک بریگیڈ کا بریگیڈ میجر تھا۔ ۱۹۷۱ء کے ابتدا میں وہ سیالکوٹ سے بھاگ کر بھارت چلا گیا تھا۔ دشمن کے اس بریگیڈ میں انڈین آرمی کے افسر اور جوان بھی تھے۔ اس فورس کو "بنگلہ دیش" کا بریگیڈ ظاہر کیا گیا تھا۔ اس حملے سے بھارت کا مقصد یہ تھا کہ سلہٹ کا کچھ علاقہ قبضے میں لے کر وہاں "بنگلہ دیش" کا ہیڈکوارٹر قائم کیا جائے۔ اس بریگیڈ کو بھارت کی توپخانہ رجمنٹ سپورٹ دے رہی تھی۔

یہ بریگیڈ متواتر دو ہفتے تابڑ توڑ حملے کرتا رہا۔ ہمارے افسر اور جوان ایسی بے جگری اور جنگی اہلیت سے لڑے کہ ہر حملہ پسپا کیا اور ہر بار قیدی بھی پکڑے اور ہتھیار اور ایمونیشن بھی پکڑا۔ اپنے توپخانے کے او پی دو دو اور تین تین توپوں سے اٹھارہ اٹھارہ توپوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ دشمن نے ستر میل لمبے فرنٹ پر حملوں کا نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان میں اپنے جوان بھی شہید اور زخمی ہوتے رہے لیکن نقصان کا تناسب یہ تھا کہ اپنا ایک جوان شہید ہوا تو دشمن کے بیس مارے گئے۔ بعض اوقات یہ تناسب ایک اور پچاس تک بھی پہنچ گیا۔ یہ ہمارے افسروں کی جنگی قابلیت، پرجوش قیادت اور جوانوں کے قہر آلود جذبے کا کرشمہ تھا۔

۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء سے دشمن کے حملوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ بریگیڈوں کے حملوں سے وہ صرف دو پلٹنوں سے ایک انچ جگہ بھی نہ لے سکا۔ یہ بڑی ہی خونریز لڑائیاں تھیں۔ اپنے افسروں اور جوانوں نے فرض شناسی اور شجاعت کے حیران کن مظاہرے کئے۔ ان کا مورال نہ صرف بلند تھا بلکہ مورال قہر اور غضب بن گیا تھا۔

۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح اس سیکٹر میں دشمن نے بہت بڑا حملہ کیا۔ اس وقت تک اپنی

نفری شہیدوں اور زخمیوں کی وجہ سے بہت ہی کم رہ گئی تھی۔کوئی کمک نہیں مل رہی تھی نہ کمک ملنے کی توقع تھی۔صرف اتنی سی مدد ملی کہ نومبر میں میجر سلیم کی زیر کمان آزاد کشمیر کی ایک کمپنی آ ملی۔سلہٹ میں ایمونیشن بظاہر کافی تھا، لیکن بہت تیزی سے خرچ ہو رہا تھا اس کے باوجود یہ مٹھی بھر جانباز دشمن کے لئے چٹانیں بنے ہوئے تھے۔ان کا جذبہ واضح کرنے کے لئے ایک نوجوان افسر لیفٹیننٹ ضمیر حسین منہاس شہید کا ذکر کافی ہو گا۔

لیفٹیننٹ ضمیر حسین منہاس شہید بیال چکوال کے رہنے والے محترم محمد خان اظہر کے فرزند تھے۔انہوں نے شہادت سے پہلے اپنے والد صاحب کو ایک خط میں لکھا تھا۔

"پاک سرزمین کو پاک رکھنے کے لئے ہمارے خون کی ضرورت ہے، جس کے لئے ہم تیار ہیں اور ہم خون دے رہے ہیں۔ بے شک نتائج مالک حقیقی کے ہاتھ میں ہیں۔"

۱۹ نومبر ۱۹۷۱ء کے روز لیفٹیننٹ ضمیر حسین شہید نے اپنے بڑے بھائی محترم محمد فاضل منہاس کو ایک خط میں لکھا تھا۔"عید کا چاند نظر آ گیا ہے۔میں عید کے دن آپ لوگوں کو یاد کر رہا ہوں گا، لیکن میرے فرائض اور وطن عزیز کا دفاع مجھے ہر حالت میں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔"

یہ جذبہ جس کا اظہار لیفٹیننٹ ضمیر حسین نے کیا تھا، پاک فوج کا بنیادی جذبہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز مشرقی پاکستان میں پاک فوج صرف جذبے کے زور پر لڑ رہی تھی ورنہ بارہ ڈویژنوں کے سہ طرفی حملے کے مقابلے میں ساڑھے تین ڈویژن فوج کوئی حیثیت نہیں رکھتی جب کہ سپلائی اور کمک کے تمام راستے اور باہمی رابطے بھی ٹوٹ گئے ہوں۔

۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کے روز اکتیس فیلڈ رجمنٹ (توپخانہ) کے لیفٹیننٹ ضمیر حسین شہید سلہٹ کے جنوب مشرق میں مولوی بازار اور شمشیر نگر کے قریب اپنی انفنٹری کی اگلی پوزیشنوں سے بھی آگے او پی تھے۔ان کے ساتھ صرف تین توپیں تھیں۔دشمن کا حملہ شدید اور زیادہ نفری کا تھا۔توپخانے کی گولہ باری نہایت خیز تھی ساتھی زیادہ توپوں کا مقابلہ صرف تین توپوں سے کیسے کیا جا سکتا تھا۔جب کہ اوپر سے انڈین ایئر فورس کے طیارے بھی

راکٹ اور مشین گنیں فائر کر رہے تھے۔

ایسی صورت حال میں جب فضا سے بھی اور زمین سے بھی بارش کی طرح فائر آ رہا ہو، او پی کا گھبرا جانا اور پوسٹ چھوڑ کر کہیں آڑ میں چلے جانا قابل فہم اور عین قدرتی ہوتا ہے، لیکن لیفٹیننٹ ضمیر حسین شہید نے ایک تو پوسٹ نہ چھوڑی دوسرے مکمل صبر و تحمل اور بردباری سے ٹارگیٹ دیکھتے اور نپے تلے فائر آرڈر دیتے رہے۔عینی شاہد بتاتے ہیں کہ لیفٹیننٹ ضمیر حسین نے صرف تین توپوں سے ایسا فائر کرایا کہ کوئی گولا ضائع نہیں گیا۔فائر مؤثر تھا مگر دشمن کا حملہ بہت ہی سخت تھا۔

دشمن کو چونکہ فضائی مدد بھی حاصل تھی اس لئے وہ بہت آگے آ گیا۔دشمن کی انفنٹری کو اتنا قریب دیکھ کر بھی چکوال کا رہنے والا یہ نوجوان نہ گھبرایا اور اپنی پوسٹ تبدیل نہ کی۔یہاں تک نوبت آ گئی کہ دشمن نے لیفٹیننٹ ضمیر حسین کی پوسٹ پر ہلہ بول دیا۔اس وقت ضمیر حسین اپنے کام میں مصروف تھے۔انہیں اُس وقت صورتحال کا علم ہوا جب وہ دشمن کے نرغے میں تھے اور ایک بھارتی میجر انہیں کہہ رہا تھا۔ "ہینڈز اپ"۔

لیفٹیننٹ ضمیر حسین کے پاس سٹین گن تھی جس کے ساتھ میگزین لگی ہوئی تھی اور گن کاک تھی۔انہوں نے ہاتھ اس طرح اوپر اٹھائے کہ سٹین گن بھی سر سے اوپر لے گئے۔جب بھارتی میجر ان کی طرف بڑھا تو لیفٹیننٹ ضمیر حسین نے بجلی کی سی تیزی سے سٹین گن نیچے کی اور کولہے کے ساتھ لگا کر ٹریگر بھی دبا دیا اور گن کو دائیں بائیں گھمایا۔ان کے فائر سے بھارتی میجر وہیں ہلاک ہو گیا اور اس کے ساتھ جو جوان تھے وہ زخمی ہو کر گرے مگر بھارتی عقب میں بھی آ گئے تھے۔عقب سے ایک مشین گن فائر ہوئی۔پورا برسٹ لیفٹیننٹ ضمیر حسین کے جسم سے پار ہو گیا اور وہ وہیں شہید ہو کر اپنا یہ عہد پورا کر گئے کہ مجھے وطن عزیز کا دفاع ہر حالت میں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔

لیفٹیننٹ ضمیر حسین منہاس شہید محمد خاں اظہر کا بیٹا نہیں وہ پاک فوج کا ضمیر تھا۔

اس سے پہلے اکتیس فیلڈ رجمنٹ کے ایک اور او پی کیپٹن سرفراز بھی شہید ہو چکے تھے۔ تیسرے او پی کیپٹن ظفر حسین گل تھے جو دشمن کے منہ کے سامنے بیٹھے فائر آرڈر دے رہے تھے۔ ۴، دسمبر ۱۹۷۱ء سے دشمن کے حملے اور زیادہ شدید ہو گئے۔ اب اپنی نفری کی کمی کا یہ عالم تھا کہ پینتیس سے چالیس میل میں صرف ایک ایک کمپنی رہ گئی تھی۔ دشمن اب ڈویژن کے توپ خانے سے گولہ باری کرتا تھا اور اس کے لڑاکا بمبار طیارے ہر لمحہ الگ قیامت بپا کئے رکھتے تھے۔ آگ کی ایسی بارش میں جب زمین اور آسمان مسلسل دھماکے بنے ہوئے ہوں، فضا میں لوہے کے ٹکڑے اور گولیاں اُڑ رہی ہوں، انسان زندہ کس طرح رہ سکتے ہیں؟ مگر ہمارے جانباز زندہ بھی رہے اور لڑتے بھی رہے۔ انہیں کوئی کمک نہیں مل رہی تھی اور کھلی جنگ شروع ہو چکی تھی۔

سب سے بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ ہماری یہ نفری فضائی مدد سے محروم تھی۔ ڈھاکہ میں صرف سولہ سیبر طیارے تھے، جنہوں نے صرف تین دن ڈھاکہ کا دفاع کیا اور گیارہ رہ گئے۔ دشمن نے مسلسل بمباری سے ہوائی اڈہ بیکار کر دیا تو گیارہ طیارے اپنے ہاتھوں تباہ کر دیئے گئے۔ اب آسمان انڈین ایئر فورس کے ہاتھ تھا پھر بھی سلہٹ کے دفاع کے لئے ہمارے جانباز لڑتے رہے۔

جب ہتھیار ڈالنے کا حکم ملا

اوپر سے صرف پیچھے ہٹنے کے ہی احکام آتے تھے۔ دشمن تو انہیں پیچھے نہ ہٹا سکا، اپنے بالائی احکام سے وہ پیچھے ہٹتے آئے۔ دشمن کی یہ کیفیت تھی کہ اتنی زیادہ جنگی قوت کے باوجود وہ ہمارے ٹروپس کی چھوڑی ہوئی جگہ پر فوراً نہیں بلکہ دو روز بعد قدم پھونک پھونک کر آتا تھا۔ آخر یہ حکم آیا کہ ایمونیشن کم استعمال کرو

اوپر سے دشمن کا دباؤ، پیچھے سے یہ حکم کہ ایمونیشن کم استعمال کرو۔ آخر ۱۶، دسمبر کی رات حکم ملا کہ ۱۷، دسمبر کی صبح تمام افسر بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں احکام لینے جائیں گے۔ اس وقت ہمارے یہ ٹروپس سلہٹ سے چار میل دور تھے۔

تمام افسر یہ سوچتے ہوئے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں گئے کہ فائر بندی کے احکام آ گئے ہوں گے۔ وہ فائر بندی قبول کرنے کے لئے تیار تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ فائر بندی ہمارے ہاں کا دستور ہے۔ ہتھیار ڈالنے کے متعلق تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ جب بریگیڈیئر سلیم اللہ کے سامنے گئے تو انہوں نے افسروں کو یہی بتایا کہ فائر بندی ہونے والی ہے۔ افسروں نے فائر بندی کو قبول کر لیا۔ تب بریگیڈیئر سلیم اللہ نے انہیں بتایا کہ ہتھیار ڈالنے کے احکام آ گئے ہیں۔ تمام افسروں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ان کی تاریخ اور ان کا جذبہ ہتھیار ڈالنے سے ناآشنا تھا۔ انہوں نے بیک زبان ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ لڑتے ہوئے جانیں دیں گے۔ ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

بریگیڈیئر سلیم اللہ نے ان پر انکشاف کیا کہ ان کے اپنے تاثرات اور ردِ عمل بھی یہی ہے۔ انہیں ۱۵، دسمبر کے روز اپنی ہائی کمان سے سلہٹ میں ہتھیار ڈالنے کے احکام ملے تھے مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے بریگیڈ کو لڑاتے رہے اور ہائی کمان انہیں ہتھیار ڈالنے کے احکام دیتی رہی۔ بریگیڈیئر سلیم اللہ نے اپنے افسروں کو بتایا کہ اب صورت ایسی ہو گئی ہے کہ ہتھیار ڈالنے ہی پڑیں گے۔ انہوں نے یہ دلیلیں پیش کیں کہ ہمیں اگلی جنگ لڑنے کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔ بچی کھچی نفری کو مروا کر بھی ہم کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ بہت سے مقامات پر، خصوصاً ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالے جا چکے ہیں، وہاں کے تمام سینئر افسر دشمن کی حراست میں ہیں۔ اگر ہم لڑتے رہے تو دشمن انہیں پریشان کرے گا۔ اپنے پاس سپلائی کی پوزیشن بھی مخدوش ہے۔ بہر حال بریگیڈیئر سلیم اللہ نے خود دو روز تک ہتھیار ڈالنے کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی اور اب وہ اپنے افسروں کو ہتھیار

ڈالنے کا حکم نہیں دے رہے تھے۔ وہ انہیں سمجھا رہے تھے۔

جب افسر سمجھ گئے کہ جذبہ زندہ ہوتے کے باوجود لڑ نہیں سکتے تو سب کے آنسو نکل آتے۔ وہ ہارے نہیں تھے انہیں دشمن کی جنگی قوت نے پیچھے نہیں ہٹایا بلکہ اپنی بالائی کمان نے ہٹایا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ دشمن کی کمر توڑتے آتے تھے۔ ان کا پلان اب یہ تھا کہ سلہٹ کے مضافات میں مورچہ بند ہو کر لڑیں گے، مگر مجموعی طور پر مشرقی پاکستان کا محاذ ٹوٹ چکا تھا۔ اب انفرادی جنگ لڑنا محض جنون تھا۔ اب تو ایک ایسی حقیقت کو قبول کرنا تھا جس کے متعلق انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ جب ہتھیار ڈالنے کے احکام لے کر اپنے جوانوں کے سامنے گئے تو ان کی زبانیں اکڑ گئیں۔ وہ جوانوں کے جوش و خروش کا سامنا نہ کر سکے۔ یہ جوان اس محاذ پر تین مہینوں سے باقاعدہ جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کے بے شمار ساتھی شہید اور زخمی ہو چکے تھے۔ وہ خود تھک کر چور ہو چکے تھے، پھر بھی اپنے افسروں کے چہروں پر انہوں نے ہوائیاں اڑتی اور ملال کی پرچھائیاں دیکھیں تو ان کا جوش و خروش اور بڑھ گیا تاکہ ان کے افسر یہ نہ سمجھیں کہ جوان تھک گئے ہیں۔

آخر افسروں نے وہ حکم سنا ہی دیا جو وہ خود بھی سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جوانوں کا ردِ عمل وہی تھا جو افسروں کا تھا۔ کئی جوان دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور باقی چیخ چیخ کر نعرے لگانے لگے۔ وہ ہتھیار ڈالنے کا حکم سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ انہیں سمجھایا گیا کہ اعلیٰ کمان ہتھیار ڈال چکی ہے اور ان کی پوزیشن دشمن کی بے پناہ قوت کے گھیرے میں ہے۔

جوانوں نے ہتھیار دشمن کو دینے کی بجائے ہتھیار توڑنے شروع کر دیئے۔ اگلے روز بریگیڈیئر سلیم اللہ اور ایک بھارتی بریگیڈیئر کی ملاقات ہوئی۔ اس دوران افسروں اور جوانوں نے توپیں، مارٹر گنیں، آر آر گنیں، گاڑیاں اور وائرلیس سیٹ بیکار کر دیئے تاکہ دشمن کے کام نہ آسکیں۔ افسروں نے اپنے ذاتی ہتھیار، سٹین گنیں اور ریوالور خاصے ایمونیشن کے ساتھ ایک جگہ گڑھا کھود کر دبا دیئے کیونکہ انہوں نے وہیں سے فرار کا ارادہ کر لیا تھا۔ اٹھارہ جوان ہتھیاروں سمیت نکل گئے۔ ان کے متعلق آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ زندہ

ہیں یا مارے گئے ہیں۔ وہ یقیناً مارے گئے ہوں گے۔ وہاں سے نکلنے کے تمام راستے دشمن کے قبضے میں تھے اور وہاں کا بچہ بچہ ان کا دشمن تھا۔

فرار کا ارادہ مضبوط تھا

سلہٹ میں ایک جگہ سب کو اکٹھا کر لیا گیا۔ افسروں نے فرار کی سکیم بنائی مگر گردوپیش کا جائزہ لیا تو انہیں ہر طرف دشمن کی فوج اور سر پر طیارے اڑتے نظر آئے۔ فوج کے اس گھیرے کے پیچھے بنگالی تھے جو پاک فوج کے کسی جوان کو جہاں دیکھتے تھے اسے قتل کر دیتے تھے۔ علاقہ دریاؤں اور ندی نالوں سے اٹا پڑا تھا۔ وہ سرحد سے نکل بھی جاتے تو جاتے کہاں؟ شمال میں بھارت، مشرق میں بھارت، جنوب میں سمندر اور مغرب میں پورا مشرقی پاکستان جو دشمن کے قبضے میں تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کر لیا، لیکن بھارتی فوج آ گئی اور افسر اور جوان قیدی بن گئے۔

کچھ دن وہاں رکھ کر انہیں آسام لے جایا گیا۔ انہوں نے پرائیویٹ کپڑے وردیوں کے اندر پہن لئے تھے یا بستروں وغیرہ میں چھپا لئے تھے، کیوں کہ وہ فرار کا ارادہ کر کے چلے تھے جس کے لئے انہیں پرائیویٹ کپڑوں کی ضرورت تھی۔ شیلانگ (آسام) لے جا کر ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک شروع کر دیا گیا۔ وہاں تک انہیں پرائیویٹ بسوں میں لے جایا گیا تھا۔ راستے میں وہاں شہریوں کو کھڑا کر دیا گیا تھا جو قیدیوں کو گالیاں دیتے اور پتھر مارتے تھے جس کیمپ میں انہیں ٹھہرایا گیا، وہاں کا کمانڈر میجر گپتا تھا جس نے ہمارے افسروں کو پہلا حکم یہ دیا کہ تم قیدی ہو، زبانیں بند رکھو، اب تمہیں بولنے کی اجازت نہیں ہے۔

شیلانگ سے انہیں بند ریل گاڑی میں یوپی کی چھاؤنی فتح گڑھ لے جایا گیا۔ ریلوے سٹیشن پر بہت سے شہری کھڑے تھے، جن میں عورتیں بھی تھیں۔ انہوں نے بھارتی فوجیوں کو ہار پیش کئے اور انہیں سیندور بھی لگایا۔ ہمارے مجاہدوں کے لئے یہ منظر بڑا ہی اذیت ناک

تھا۔ انہیں چھاؤنی میں لے گئے۔ راجپوت سنٹر کی بہت سی بارکوں کے ارد گرد تار لگا کر قیدی
کیمپ بنا دیا گیا جسے نمبر ۴۵ کہا گیا۔ ایک لمبی بارک میں تقریباً پچاس افسر رکھے گئے۔ دیگر رینکس
کی تعداد ساڑھے تین ہزار تھی۔ افسروں نے وہاں پہنچتے ہی فرار کی سکیمیں بنانی شروع کر دیں۔
اتفاق سے وہاں کچھ ایسے افسر اکٹھے ہو گئے جو غیر معمولی طور پر جوشیلے تھے، اور جو ایک لمحے
کے لئے بھی ہندو کی قید برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

یوں تو ہمارے کسی بھی جوان نے ہندو کی قید کو قبول نہیں کیا۔ وہ قیدی کیمپوں میں بھی
جنگ لڑتے رہے لیکن فرار ایک ایسی مہم ہے جس کے لئے ہر کوئی تیار نہیں ہو سکتا۔ اس کے
لئے خاص قسم کے ذہن اور ہر طرح کی اذیت برداشت کرنے والے جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔
فرار کا بنیادی جذبہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں دشمن کے خلاف نفرت کا طوفان ہو۔ ان خوبیوں کے
علاوہ فرار کے لئے پلان نہایت ضروری ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ کیمپ سے نکلنا اور دوسرا
مرحلہ دشمن کے ملک سے نکلنا۔ اس مرحلے میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ فرار کا انکشاف چند گھنٹوں
بعد ہی ہو جاتا ہے۔ فوراً فوج، پولیس اور پولیس کے مخبر حرکت میں آ جاتے ہیں۔ تمام ملک کی
پولیس کو خبردار کر دیا جاتا ہے تلاش اور تعاقب کے اس جال سے نکلنا بیحد مشکل ہوتا ہے۔
اور اس صورت میں جب مغربی پاکستان کا ایک پنجابی بھارت کے صوبہ یو پی سے نکلنے
کی کوشش کر رہا ہو، اس کا پہچانا جانا آسان ہوتا ہے۔

فرار کا وہ مرحلہ تو بے حد خطرناک ہوتا ہے، جب بھاگنے والا پکڑا جاتا ہے۔
اس پر کوئی باقاعدہ مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔ وہ دشمن کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اسے
ایسی ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں کہ سن کر ہی جسم کانپنے لگتا ہے۔ اکثر قیدی بڑی ہی اذیت ناک
موت مرتے ہیں اور جو زندہ رہتے ہیں، وہ جسمانی یا دماغی لحاظ سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو
جاتے ہیں۔ اگر کوئی سنتری انہیں فرار ہوتا دیکھ لے تو گولی مار دیتا ہے۔ چنانچہ فرار ہونے والوں
کو یہ نتائج قبول کر کے فرار کی سکیم بنانی ہوتی ہے۔
ان تمام مراحل پر ذرا غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت کے قیدی کیمپوں سے
ہمارے جن مجاہدوں نے فرار ہونے کی کوششیں کیں، ان میں جرأت اور حب الوطنی کا جذبہ

کتنا زیادہ تھا اور ان کے دلوں میں دشمن کی کتنی نفرت تھی۔ میں نے ان میں سے بعض جانبازوں
سے پوچھا ہے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جو انہیں فرار کے لئے تیار کرتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ
وہ قید کی تکلیفوں سے نہیں بھاگتے تھے بلکہ وہ ہندو کی قید میں نہیں رہنا چاہتے تھے کیونکہ
وہ ہندو کو فاتح نہیں سمجھتے تھے۔

کیمپ نمبر ۴۵ سے جن افسروں نے فرار کی سکیم بنائی ان کے لیڈر میجر نادر پرویز تھے۔
رن کچھ کے معرکے ۱۹۶۵ء میں نادر پرویز لیفٹیننٹ تھے۔ وہاں غیر معمولی شجاعت کے صلے
میں انہیں ستارۂ جرأت دیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کھیم کرن کے محاذ پر لڑے۔ وہاں بھی انہوں
نے نام پیدا کیا۔ رن کچھ میں انہوں نے ہندو کو شکست دی اور کھیم کرن محاذ پر بھی ہندو
کو شکست دی مگر مشرقی پاکستان جا کر وہ جذبے اور شجاعت کے باوجود ہندو کے قیدی
ہو گئے۔ انہوں نے فرار کی سکیم پیش کی تو ان کے چچا زاد بھائی میجر طارق پرویز، کیپٹن ظفر حسین
گل، لیفٹیننٹ (اب کیپٹن) انور احمد اور لیفٹیننٹ یٰسین ان کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے
تمام افسروں کو جن کی تعداد پچاس تھی، بتا دیا کہ وہ فرار کی کوشش کریں گے۔
فرار کے لئے انہیں بھارتی کرنسی اور شہری کپڑوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے
تھوڑی تھوڑی کرنسی حاصل کر لی تھی اور شہری کپڑوں کا بھی ایک ایک جوڑا چھپا کر رکھا ہوا
تھا۔ قیدی کیمپ میں آنے سے پہلے اور بعد کئی بار ان کی تلاشی لی گئی تھی۔ ان کی گھڑیاں
بھی اتار لی گئی تھیں، لیکن انہوں نے ہتھیار ڈالتے ہی فرار کی سکیم بنا لی تھی، اس لئے کپڑے
اور گھڑیاں کہیں چھپا لی تھیں۔ بھارتیوں کو قیدیوں کے پاس جو بھی فالتو کپڑا نظر آتا تھا وہ
لے جاتے تھے یا اس پر کالے رنگ سے کراس کا نشان لگا دیتے تھے اور برش سے اس
پر POW لکھ دیتے تھے۔ فرار ہونے والے افسر اپنے پرائیویٹ کپڑوں کو ان نشانات
سے بچا رہے تھے۔
کیمپ کے حفاظتی انتظامات ملاحظہ فرمائیے۔ ارد گرد خاردار تار کے گول گچھے لگائے
گئے تھے۔ یہ اتنے گھنے ہوتے ہیں کہ ان میں سے سانپ بھی شاید نہ گزر سکے۔ ان کے پیچھے
سیدھے خاردار تار کھمبوں سے لگے ہوئے تھے۔ ان سے چند گز پرے خاردار تاروں کی

ایک اور رتہ تھی۔ درمیان میں جو جگہ خالی تھی اس میں دو سنتری اور دو خونخوار کتے پھرتے رہتے تھے۔ بہت سی بلند مچانیں تھیں، جن میں بڑی تیز سرچ لائٹیں اور مشین گنیں ہر لمحہ تیار رہتی تھیں۔ سرچ لائٹوں کی روشنی خاردار تاروں کے اندر اور اردگرد کے علاقے کو روشن کئے رکھتی اور گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ کیمپ کا صرف ایک گیٹ تھا جہاں پوری گارد ہوتی تھی۔ کیمپ کے اندر نگرانی کا یہ عالم تھا کہ کسی قیدی کی کوئی حرکت چھپی نہیں رہتی تھی۔ اچانک تلاشی ہو جاتی تھی۔ بڑے افسر بھی دورے پر آتے رہتے تھے۔ کوئی قیدی اپنے پاس کوئی فالتو چیز خصوصاً اوزار، چھری، چاقو، لوہے کی چھوٹی سی پتری بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔

ان حالات میں فرار کا راستہ صرف ایک تھا — سرنگ — تاریں نہیں پھلانگی جا سکتی تھیں، لیکن ہمارے تین جوانوں نے یہ کمال بھی کر دکھایا تھا کہ تاروں میں سے نکل گئے تھے مگر وہ اگلے مرحلے کے لئے تیار نہیں تھے اور نہ ان کے پاس کوئی انتظام تھا اس لئے کیمپ سے تھوڑی دور گئے تو پکڑے گئے۔

ان پانچ افسروں نے سرنگ نکالنے کا فیصلہ کیا اور جب لمبائی کا حساب کیا تو دو سو فٹ لمبی سرنگ کی ضرورت تھی۔ سرنگ تاروں کے نیچے سے گزارنی تھی اور دور اُس جگہ تک لے جانی تھی، جہاں ڈیڑھ دو فٹ اونچی گھاس تھی۔ اوزاروں کی ضرورت تھی۔ صرف دو اوزار میسر آسکے۔ ایک تو لوہے کا ایک کیل تھا اور ایک عام سی چھری جو گھروں میں سبزی وغیرہ کاٹنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ تیسرا اوزار جذبہ تھا۔ یہی ایک اوزار کام دے سکتا تھا۔ ان پانچوں نے اپنے تمام افسروں کو فرار کی سکیم بتائی تو تمام کے تمام تعاون کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ افسروں کے باہمی پیار کا مظاہرہ تھا۔ ان کے تعاون کے بغیر فرار ممکن نہیں تھا۔ تعاون میں یہ عمل ضروری تھا — سرنگ کھودنے اور اسے چھپائے رکھنے میں مدد۔ مٹی غائب کرنے میں مدد۔ کھدائی کے دوران پہرہ دینا اور دشمن کو ایسے جھانسے میں رکھنا کہ

اسے بھنک بھی نہ ملے — حالانکہ تمام افسر جانتے تھے کہ انہیں فرار میں مدد دینے کی جو سزا ملے گی وہ فرار کی کوشش کی سزا جتنی سنگین ہو گی۔ پھر بھی تمام افسروں نے تعاون کا فیصلہ کر لیا۔

سُرنگ کی کھدائی شروع ہو گئی

افسر ایک لمبی بارک میں رہتے تھے۔ اس بارک میں انہوں نے ایک دیوار کھڑی کر کے کچھ حصہ الگ کر دیا تھا۔ اس حصے کو پانچ حصوں میں تقسیم کر کے پانچ غسلخانے بنائے تھے۔ ان میں نل لگا دیئے گئے تھے۔ کونے والے یعنی پہلے غسلخانے کا فرش توڑ کر سرنگ کھودنے کا فیصلہ کیا گیا۔ فرش سیمنٹ کا تھا۔ اسے رات کے وقت نہیں توڑا جا سکتا تھا کیونکہ دھماکوں کی آوازوں سے سنتری آ جاتے۔ اُن افسروں میں پاک فوج کے انجنیئر افسر بھی تھے۔ وہ سیمنٹ توڑنے اور جوڑنے کے ماہر تھے۔ فرش صرف دن کے وقت توڑا جا سکتا تھا۔ آواز کو دبانے کا انتظام بھارتیوں نے خود ہی کر رکھا تھا۔ وہ یہ تھا کہ کیمپ کے بالکل قریب راجپوت ٹریننگ سنٹر کے رنگروٹوں کی چاندماری کے لئے شارٹ رینج تھا۔ دن کے وقت رنگروٹ وہاں رائفل فائرنگ کرتے تھے۔ ان کی آواز بہت ہی بلند تھی۔ اسی دوران ہمارے افسروں نے لوہے کے کیل سے فرش توڑنا شروع کیا۔ کیل پر پتھر مارے جاتے۔ یہ آوازیں رائفلوں کی مسلسل فائرنگ میں دبی رہتیں۔ ایک دو افسر باہر ٹہلتے رہتے تاکہ کوئی خطرہ آ رہا ہو تو کھانس کر خبردار کر دیں۔

فرش توڑ لیا گیا۔ سیمنٹ کے ٹکڑے محفوظ رکھ لئے گئے۔ آگے کچی زمین تھی جس کی کھدائی چھری سے شروع کی گئی۔ دہانہ تقریباً چار فٹ قطر رکھا گیا — یہ کھدائی جنوری ۱۹۷۲ء میں شروع کی گئی۔

مٹی غائب کرنے کی ایک جگہ موجود تھی۔ یہ خاص قسم کے بیت الخلاء تھے۔ ایک بہت لمبا، چوڑا اور بہت ہی گہرا گڑھا کھودا جاتا ہے۔ اس کے اوپر ٹینڈل یا مضبوط لکڑی

سے بیٹھنے کی جگہیں بنائی جاتی ہیں۔ جن کی شکل کموڈوں کی سی بن جاتی ہے۔ نیچے گڑھا اتنا گہرا ہوتا ہے جس میں پورے مکان کا ملبہ سما جاتا ہے۔ اسے DEEP TRENCH BATRINE کہا جاتا ہے۔ تمام افسروں نے مٹی غائب کرنے میں اس طرح تعاون کیا کہ وہ لوٹوں میں مٹی بھر کر اس بیت الخلا میں چلے جاتے اور مٹی گہرے گڑھے میں پھینک آتے۔ لوٹا اٹھائے ہوئے کوئی آدمی بیت الخلاء کی طرف جا رہا ہو تو اس پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ تمام افسر مٹی اور لوٹے کے باہمی رشتے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مٹی غائب کرتے رہے۔

پہلے سُرنگ اُوپر سے نیچے لے جائی گئی، یعنی یہ ایک گڑھا تھا۔ افسروں نے یہ تعاون بھی کیا کہ اس غسلخانے میں نہانا چھوڑ دیا۔ اسے اکثر بند رکھتے۔ دن بھر کی کھدائی کے بعد یا کھدائی کے دوران خطرے کی صورت میں سُرنگ کے منہ کو اس طرح چھپایا جاتا کہ کچی جگہ ایک تختہ رکھ دیا جاتا، اور اس کے اوپر سیمنٹ کے وہ ٹکڑے فٹ کر دیئے جاتے جو یہاں سے توڑے گئے تھے۔ کچھ ریت محفوظ رکھی جاتی تھی جو ٹکڑوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی درزوں میں بھر دی جاتی تھی۔ ہر روز دو دفعہ افسروں کی رول کال (گنتی) ہوتی تھی۔ صبح اور شام۔ تمام افسروں کو ایک جگہ فال اِن کیا جاتا تھا۔ دونوں وقت تمام افسر موجود ہوتے تھے۔

صرف ایک چھوٹی سی چھری سے تین دنوں میں سات فٹ کے قریب گہرا گڑھا کھود لیا گیا۔ اب سرنگ شروع کرنی تھی جسے زمین کے متوازی کیمپ سے باہر جانا تھا۔ سنتری بھی موجود تھے۔ کتے بھی موجود تھے۔ رول کال بھی ہوتی تھی۔ اچانک چیکنگ بھی ہوتی تھی۔ نگرانی بڑی ہی سخت تھی۔ ان خطروں میں سرنگ کی کھدائی شروع کر دی گئی۔ یہ کام بھی دن کے وقت ہوتا تھا۔ سرنگ سے مٹی باہر لانے کے لئے چادریں وغیرہ پھاڑ کر تھیلیاں بنائی گئی تھیں۔ مٹی لوٹوں سے بیت الخلا میں غائب ہوتی رہی اور سرنگ تیس فٹ سے آگے نکل گئی۔

سُرنگ کے اندر زخم اور خون

وہاں دو دشواریوں کا سامنا ہوا۔ ایک یہ کہ اندر دم گھٹتا تھا۔ آکسیجن کی کمی تھی۔ دوسرے اندھیرا۔ اندھیرے کا علاج یہ کیا کہ ڈبوں کو کاٹ کر دیئے بنائے۔ راشن کچا ملتا تھا جو قیدی خود پکاتے تھے۔ گھی جو ملتا تھا اس میں سے کچھ وہ دیئے میں استعمال کرتے تھے مگر سرنگ کے اندر دیئے نے حبس اور گھٹن میں اضافہ کر دیا۔ ذرا سی جو آکسیجن ہوتی تھی وہ دیئے کی لَو کھا جاتی تھی۔ حبس کو کم کرنے کے لئے یہ اہتمام کیا کہ ایک جگہ سے چھری سے اوپر کو سوراخ کرنا شروع کیا۔ یہ سوراخ اتنا ہی کھلا رکھنا تھا جتنی چھری چوڑی تھی۔ چھری کو ایک ڈنڈے کے سرے سے باندھ کر ڈنڈا گھما گھما کر پورا کیا گیا۔ سوراخ نیچے سے چوڑا رکھا گیا تاکہ ڈنڈے کے ساتھ ہاتھ بھی کچھ دور اوپر تک جا سکے۔ جوں جوں سوراخ اوپر جا رہا تھا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر چھری اوپر کو باہر نکل گئی۔ ڈنڈا گھمایا تو چھری نے سوراخ کھلا کر دیا۔ اس سوراخ نے یہ کام کیا کہ تمام حبس اُوپر کو نکل گیا اور سانس لینے کی دشواری ختم ہو گئی۔

قیدی افسروں کے پاس ایک ٹارچ تھی۔ لیکن سیل نہیں تھے۔ ایک روز بھارتیوں نے یہ کرم کیا کہ انہیں دو ٹرانسسٹر دے دیئے۔ افسروں نے ایک کے سیل نکال کر ٹارچ میں ڈال لئے اور سرنگ میں روشنی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ مٹی غائب کرنے کا ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا گیا تھا۔ وہ یہ کہ سردی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افسر کمبل اوڑھ لیتے تھے اور مٹی کی تھیلی کمبل میں چھپا کر بیت الخلا میں لے جاتے تھے۔

سردیاں گزر گئیں تو صرف لوٹوں کا ذریعہ رہ گیا لیکن یہ ذریعہ مطلوبہ رفتار سے سست تھا۔ اس کے لئے یہ ذریعہ پیدا کیا گیا کہ ایک والی بال گراؤنڈ اور ایک ٹینس کورٹ بنانے کی اجازت مل گئی۔ دونوں گراؤنڈوں کو ہموار کرنے اور پانی چھڑکنے کا کام افسروں نے اپنے ذمے لے لیا۔ پانی کے چھڑکاؤ کے لئے انہوں نے کیمپ کے سٹور سے دو تین بالٹیاں لے لیں۔ چھڑکاؤ کے لئے پانی جمع کرنے کے لئے انہوں نے غسل خانوں کے قریب اجازت لے کر چار فٹ چوڑا اور پانچ چھ فٹ گہرا گڑھا کھود لیا جس میں تمام غسلخانوں کا پانی جمع ہونے لگا۔ افسر ایک بالٹی میں پانی لے جاتے اور باقی بالٹیوں میں سرنگ کی مٹی بھر کر لے جاتے۔ نظر بچا کر مٹی پھیلا دیتے اور پانی چھڑک دیتے۔

سرنگ بہت آگے نکل گئی تھی۔ آگے پھر حبس اور گھٹن شروع ہو گئی۔ وہاں چھڑی ڈنڈے سے باندھ کر اوپر کی طرف ایک اور سوراخ کیا گیا۔ اس سے سرنگ کی ہوا صاف ہو گئی۔ یہ سوراخ اضافی کام تھا، جس میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا۔ سرنگ جب لمبی ہو گئی تو مٹی باہر لانے میں دشواری پیش آنے لگی۔ سرنگ دو فٹ سے ذرا زیادہ چوڑی اور اتنی ہی اونچی تھی۔ مٹی نکالنے والے رینگ کو اندر جاتے، تھیلیوں میں مٹی بھرتے اور الٹے رینگ کر تھیلیاں اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے لے آتے تھے۔

یہ کام بڑا ہی صبر آزما تھا۔ ان کی کہنیاں زخمی ہو گئی تھیں۔ ان سے خون رستا تھا اور ہر روز انہی زخموں کے بل رینگ رینگ کر زخم کھلتے جا رہے تھے۔ ان زخموں کو وہ بھارتی افسروں سے آستینوں میں چھپائے رکھتے تھے۔ جوں جوں سرنگ آگے بڑھتی جا رہی تھی، افسروں کی ہیجانی کیفیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا کسی بھی لمحے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ اتنی دور آگے نکل جانے کے بعد پکڑے جانا بڑا ہی روح کش حادثہ تھا۔ افسروں کے دل بعض اوقات اچھل کر حلق میں آ جاتے تھے۔ جون ۱۹۷۲ء کے آخر تک سرنگ آخری خاردار تاروں سے بھی آگے نکل گئی۔ وہاں تک تازہ ہوا کے لئے تین مزید سوراخ اوپر کو نکالے گئے۔ ان سے تمام کی تمام سرنگ ایئر کنڈیشنڈ ہو گئی۔

اتنی دور سے مٹی باہر لانا اور زیادہ مشکل ہو گیا۔ زخمی کہنیوں سے رینگنا بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ زخم درد کرتے تھے اور ان سے خون رسنے لگتا تھا۔ مٹی نکالنے کے کام کو ایک کِٹ بیگ سے سہل کیا گیا۔ یہ فوجی بیگ مضبوط ہوتا ہے اور اس میں پچیس تیس سیر مٹی آ سکتی ہے۔ رسیوں کے ٹکڑے جوڑ کر لمبی رسی بنائی گئی۔ سرنگ کھودنے والے کِٹ بیگ ساتھ لے جاتے اور مٹی سے بھر دیتے۔ اس کے منہ کے ساتھ رسی بندھی ہوئی تھی۔ سرنگ کے غسلخانے والے سرے سے رسی کھینچی جاتی اور بیگ باہر آ جاتا۔ مگر ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ راستے میں ایک جگہ سرنگ ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ وہاں کِٹ بیگ پھنس جاتا تھا۔ کسی نہ کسی کو وہاں جا کر بیگ آگے چلانا پڑتا تھا۔ اس طرح رینگنے کی ضرورت پھر آ پڑی۔

اس مرحلے پر دو مشکلیں پیدا ہو گئیں۔ ایک یہ کہ گڑھے والا بیت الخلا بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور افسروں کی بارک کے قریب فلش سسٹم والی ٹٹیاں تعمیر ہونے لگیں۔ دوسری مشکل یہ کہ ساون کی بارشیں شروع ہو گئیں، جن کی وجہ سے گراؤنڈوں میں پانی چھڑکنے کی ضرورت نہ رہی۔ اسی بہانے مٹی گراؤنڈوں میں پھیلائی جاتی تھی۔ بارشوں کی وجہ سے یہ ذریعہ بند ہو گیا۔ مٹی اتنی زیادہ نکل رہی تھی جو صرف لوٹوں کے ذریعے غائب نہیں کی جا سکتی تھی۔ انجینئرز افسروں نے یہ کمال کیا کہ فلش سسٹم کے جو بیت الخلا تعمیر ہو رہے تھے وہاں سیمنٹ اور ریت پڑی تھی۔ وہ رات کے وقت سیمنٹ اور ریت چرا لائے اور اس کا ایک سیب اس سائز کا بنا لیا جو سائز غسلخانے والے گڑھے کے منہ کا تھا۔ سیب خشک ہو گیا تو اسے گڑھے کا منہ چھپانے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ اسے بڑی خوبی سے وہاں فٹ کیا جاتا تھا مگر مٹی غائب کرنے کا کوئی خاطر خواہ ذریعہ نہ رہا۔ اس سے کام بند ہو گیا۔ سرنگ تاروں سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ ابھی اور آگے لے جانے کا ارادہ تھا تاکہ کیمپ سے دور جا کر نکلیں، لیکن کام رک جانے سے وہ سوچنے لگے کہ اسی جگہ سے سرنگ اوپر کو لائی جائے تو خطروں سے بچنے کے کتنے کچھ امکانات ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ یہیں سے اوپر آ جائیں۔ ساون کی بارشوں سے وہاں گھاس گھنی اور اونچی ہو گئی تھی۔

ایک روز ایک آدمی اندر گیا تو یہ خبر لایا کہ تازہ ہوا کے لئے جو سوراخ کئے گئے
تھے ان میں سے بارشوں کا پانی سرنگ میں چلا گیا ہے جس سے اندر کیچڑ بھر گیا ہے
لہٰذا بارشیں رکنے کا انتظار کیا جائے۔ پورے دو مہینے انتظار کیا گیا جو بڑا ہی صبر
آزما تھا۔ ستمبر کے وسط میں اندر گئے تو کیچڑ کچھ کم ہو گیا تھا۔ جہاں زیادہ تھا وہاں
سرنگ سے مٹی کھود کر ڈالی اور کیچڑ کم کیا۔ پھر سرنگ جہاں ختم کی تھی وہاں سے اوپر کو کھدائی
شروع کر دی گئی۔ مٹی کٹ بیگ اور چھوٹی تھیلیوں کے ذریعے باہر نکالی گئی۔ کچھ پانی
کے گڑھے میں پھینکی، کچھ بیت الخلاء میں۔ یہ مٹی کی آخری کھیپ تھی۔ اب سرنگ زاویے
پر اوپر جا رہی تھی۔ آخر زمین کی سطح آ گئی جہاں کھدائی روک دی گئی۔ پرائیویٹ کپڑے
جو فرار کے بعد پہننے تھے وہ سرنگ میں رکھ دیئے گئے۔

وہ سُرنگ سے نکلے

۱۸/۱۷ ستمبر ۱۹۷۲ء کی درمیانی رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ میجر نادر پرویز،
میجر طارق پرویز، کیپٹن ظفر حسین گل، لیفٹیننٹ نور احمد اور لیفٹیننٹ یسین فرار کیلئے
تیار ہو گئے۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ دو پارٹیوں میں باہر نکلیں اور باہر جا کر اکٹھے نہ رہیں بلکہ
الگ الگ ہو کر بھارت سے نکلنے کی کوشش کریں۔ اکٹھے پکڑے جانے کا بھی خطرہ تھا
اور شک بھی جلدی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ پہلے میجر نادر پرویز، میجر طارق پرویز اور لیفٹیننٹ
نور احمد نکلے۔ سب نے انہیں غسلخانے کے گڑھے پر جا کر خدا حافظ کہا اور سلامتی کی
دعائیں دیں۔ منظر جذباتی تھا۔ ان تینوں کو ساتھی ایسے سفر پر رخصت کر رہے تھے۔ جس
کی منزل موت تھی اور امکانات اسی کے تھے۔ وہ تینوں مر کر یا زندہ نکل کر ساری دنیا
پر ثابت کرنے جا رہے تھے کہ وہ شکست خوردہ نہیں اور وہ ہندو کی قید کبھی قبول نہیں
کریں گے۔ یہ تینوں جانباز اپنے ساتھیوں سے پاکستان میں ملنے کی تمنا اور کبھی نہ ملنے کی توقع
لے کر ایک دوسرے کے پیچھے گڑھے میں اتر گئے۔

ایک گھنٹے بعد کیپٹن ظفر حسین گل اور لیفٹیننٹ یسین غسلخانے میں گئے انہیں بھی
افسروں نے سلامتی کی دعائیں دیں اور خدا حافظ کہا وہ بھی ایک دوسرے کے پیچھے گڑھے
میں اُتر گئے۔ اُن کی کہنیاں پہلے ہی زخمی تھیں۔ وہ رینگتے ہوئے سرنگ کے آخری
سرے تک جا پہنچے۔ ان کے پہلے ساتھیوں نے سرنگ کا منہ کھول دیا تھا اور
وہ جا چکے تھے۔

اب ہم آپ کو کیپٹن ظفر حسین گل اور لیفٹیننٹ یسین کے فرار کی داستان سنائیں گے۔
دوسرے تین افسروں کی روئیداد آپ پڑھ چکے ہیں۔

کیپٹن ظفر حسین گل نے سرنگ سے سر نکالا تو رات کی خنک ہوا کا جھونکا آیا۔ کیپٹن
گل نے کچھ ایسا کیف اور سرور محسوس کیا جیسے وہ اچانک جہنم سے جنت میں آ گئے
ہوں حالانکہ ان کے سفر کا بے حد خطرناک مرحلہ ابھی شروع ہوا تھا، مگر یہی ہوا خاردار
تاروں کے اندر لُو کے تھپیڑوں کی طرح بُری لگتی تھی۔ یہ اسیری اور آزادی کے فرق
کی خنکی اور سرور تھا۔ وہ آزاد تھے۔ اب انہیں یہ حکم دینے والا کوئی نہیں تھا کہ یہاں
کھڑے ہو جاؤ، یہاں بیٹھ جاؤ، یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اب وہ اپنے حکم کے پابند تھے۔
وہ دونوں کیپٹن ظفر گل اور لیفٹیننٹ یسین باہر نکلے اور اونچی گھاس میں لیٹ گئے۔
خطرہ ان کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ان سے بمشکل بیس گز دور گارد کے خیمے تھے جن کے
سامنے سنتری کھڑا تھا۔ اتفاق سے سنتری کا منہ کیمپ کی طرف تھا۔ اُسے بالکل علم
نہیں تھا کہ پانچ پاکستانی پورے بھارت کی آنکھوں میں دو سو فٹ لمبی سرنگ کی مٹی
جھونک کر جا رہے ہیں۔ وہ دونوں نہایت آہستہ آہستہ گھاس میں رینگنے لگے۔ رات
کے سکوت میں ذرا سی آہٹ بھی سنتری کو چوکنا کر سکتی تھی۔ وہاں سے سرچ لائٹوں
والا ٹاور ساڑھے تین سو گز دور تھا۔ ہر لمحہ خطرہ تھا کہ سرچ لائٹ کی تیز روشنی ان پر پڑے گی۔
وہ دم سادھ کر رینگتے گئے اور سنتری سے دور ہٹتے گئے۔ گارد ابھی جاگ رہی تھی۔ رات
ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔

وہ کوئی پچاس گز گئے ہوں گے کہ گھاس ختم ہو گئی اور ننگی زمین آ گئی۔ تھوڑی
دور آگے درخت تھے۔ وہ پیٹ کے بل درختوں کی طرف رینگنے لگے۔ آگے ایک

برساتی نالہ آگیا اور اس کے کنارے جھاڑیاں نظر آئیں۔ وہ دونوں جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ وردی اتار کر جھاڑیوں میں چھپا دی اور پرائیویٹ کپڑے پہن لئے۔ ان کپڑوں پر قیدی کیمپ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ کپڑے تبدیل کرکے انہوں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے دیکھا۔ انہیں کیمپ کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ سرچ لائٹوں کی سفید لکیریں خاردار تاروں کے جنگل پہ گھوم رہی تھیں۔ سنتری اور گشتی بھی تاروں کے درمیان پھر رہے تھے۔

اس مقید دنیا کو دیکھ کر ان کے حوصلوں میں تازگی آگئی اور وہ مکمل خود اعتمادی اور تحمل سے اگلے سفر کا پلان بنانے لگے۔ ان کی کل متاع ایک گھڑی اور دس بھارتی روپے اور اللہ کا نام تھا۔ یہ دونوں چیزیں کیپٹن ظفر حسین گل کے پاس تھیں۔ انہوں نے کیمپ میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ باہر جا کر الگ الگ ہو جائیں گے اور اکیلے اکیلے دشمن کے ملک سے نکلنے کی کوشش کریں گے، لیکن باہر جا کر انہوں نے ایک دوسرے سے جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ سفر ہی ایسا تھا۔ انہوں نے منزل تک اکٹھے رہنے کا فیصلہ کیا۔ منزل پاکستان تھی یا موت۔

انہوں نے کیمپ میں سنتریوں اور بھارتی افسروں سے گپ شپ لگاتے کئی ایک معلومات فراہم کر لی تھیں۔ ان میں ایک یہ تھی کہ وہاں سے بریلی شہر تیس میل دور تھا اور قریبی قصبہ آٹھ میل کے قریب فرخ آباد تھا۔ وہ چل پڑے، اور ایک گاؤں میں سے گزرے۔ وہ اجنبی تھے۔ اردو بول تو سکتے تھے لیکن مقامی لوگوں کے لب و لہجے سے نہیں بول سکتے تھے۔ فوراً شک ہوتا تھا کہ یہ اجنبی ہیں اور پنجابی ہیں۔ اور اگر پنجابی ہیں تو یہ مفرور قیدی بھی ہو سکتے ہیں۔

وہ گاؤں میں سے گزر گئے ایک دیہاتی سے پوچھنے پر انہیں پتہ چلا کہ آگے دریائے گنگا ہے۔ وہاں پتن بھی ہے اور پل بھی۔ وہ دریا تک گئے تو وہاں پتن تھا نہ پل۔ وہ سڑک پہ چل پڑے۔ انہیں کوئی علم نہ تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ میلوں کے پتھروں پہ ہندی لکھی ہوئی تھی۔ وہ اس یقین پہ چلتے گئے کہ کوئی نہ کوئی شہر یا قصبہ آئیگا

ہی۔ وہ کسی شہر میں پہنچنے کے لئے بے تاب تھے کہ شہر کے ہجوم میں انسان چھپ جاتا ہے۔ دیہات اور ویرانے میں پکڑے جانے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ سات آٹھ میل گئے ہوں گے کہ انہیں روشنیاں نظر آنے لگیں۔ قریب پہنچے تو انہیں ایک بورڈ نظر آیا جس کی تحریر انگریزی کی تھی نیچے فرخ آباد لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک قصبہ ہے۔

فتح گڑھ سے بھاگے،
فتح گڑھ جا پہنچے

کیپٹن گل اور لیفٹیننٹ یسین کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ رات گزرنے سے پہلے پہلے فتح گڑھ سے بہت دور نکل جائیں۔ پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے کا مسئلہ بہت بعد کا تھا۔ انہوں نے ایک سکیم یہ بنائی کہ کوئی کار نظر آجائے تو کار پر قبضہ کرکے اس کے ڈرائیور کو مار ڈالیں گے یا اسے باندھ کر کہیں دریا میں پھینک دیں گے، مگر انہیں کوئی کار نظر نہ آئی۔ فرخ آباد میں بس بھی کوئی نہیں تھی۔ ایک ٹرک ڈرائیور سے کہا کہ انہیں بریلی تک لے چلے۔ اسے اپنی کوئی مجبوری بتائی اور منت بھی کی، لیکن ڈرائیور نے انہیں لفٹ نہ دی۔ انہیں ریل گاڑی کی آواز آئی تو انہیں اطمینان ہوا کہ یہاں ریلوے سٹیشن ہے۔

وہ ایک سائیکل رکشا میں بیٹھے اور ریلوے سٹیشن پہنچے۔ مسافر گاڑی آ کر رکی ہی تھی۔ اور کانپور جا رہی تھی۔ اُن کے پاس صرف دس روپے تھے۔ کانپور وہاں سے پچاس میل دور ہے۔ اِن پیسوں میں وہ کانپور تک ہی پہنچ سکتے تھے۔ کچھ وہ سائیکل رکشا والے کو دے چکے تھے۔ انہوں نے کانپور کے ٹکٹ لئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انہیں بالکل علم نہیں تھا کہ راستے میں کونسے بڑے سٹیشن آئیں گے۔

گاڑی جب چلی اُس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک سٹیشن پر رکی۔ کیپٹن ظفر گل اور لیفٹیننٹ یسین نے ریلوے سٹیشن کا نام پڑھا تو خوف سے ان کے دل ڈوب گئے۔ یہ فتح گڑھ تھا۔ وہ یہیں سے بھاگے تھے۔ انہیں خطرہ یہ نظر آنے لگا کہ ان کے فرار کا انکشاف ہو چکا ہوگا اور پولیس ریل گاڑی

کی تلاشی لے گی۔ قیدی کیمپ نمبر ۴۵ کے بھارتی افسر بھی آجائیں گے اور وہ پکڑے
جائیں گے۔ وہ جہاں تھے وہیں منجمد ہو گئے مگر چوکنے رہے تاکہ پولیس یا فوج کے
آدمی ڈبے میں آئیں تو وہ نظر بچا کر نکل جائیں۔

گاڑی چلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ایک ایک لمحہ پوری پوری رات جتنا طویل
ہو رہا تھا۔ اتنی زیادہ محنت سے وہ کیمپ سے بھاگے تھے، دور بھی نکل گئے تھے
مگر گاڑی انہیں سیدھی پھندے میں لے آئی۔ انہوں نے ہیجان اور خوف کو ذہن
سے جھٹک کر صورت حال کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا اور وہاں سے کھسکنے
کی ترکیبیں سوچنے لگے، مگر وہ سیٹ سے اٹھتے بھی نہیں تھے کہ پکڑے جائیں گے۔

اس بے رحم کو مگو اور تعطل میں نصف گھنٹہ گزر گیا اور انجن کی وسل سنائی دی۔
گاڑی چل پڑی۔ گل اور لیٹین دعائیں کرنے لگے کہ یا خدا اس کی رفتار فوراً تیز کر دے۔
گاڑی رینگتے رینگتے پلیٹ فارم سے نکل گئی اور فتح گڑھ کی روشنیاں پیچھے ہٹتے ہٹتے
رات کی تیرگی میں گم ہو گئیں۔ گاڑی تیز ہی تیز ہوتی چلی گئی۔ پھر سٹیشنوں پر رکتی رہی
اور چلتی رہی۔ آخر کار کانپور پہنچ گئی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

یہ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کی صبح تھی۔ رات کا اندھیرا چھٹ گیا تھا جس نے قید سے بھاگنے
والوں کو چھپا رکھا تھا۔ اب وہ ہر کسی کو نظر آ رہے تھے۔ چہروں پر شب بیداری کے
اثرات نمایاں تھے۔ بھوک کا تاثر بھی شامل ہو گیا تھا اور ہیجانی کیفیت بھی طاری تھی
جسے چھپانا ضروری تھا۔ اب ان کے پاس صرف گھڑی رہ گئی تھی یہ قیمتی اومیگا گھڑی
تھی۔ اسے بازار میں بیچنا تھا۔ کسی نے انہیں بتایا کہ کانپور میں بازار نو بجے کھلتے ہیں۔
کانپور خاصا بڑا شہر ہے جس کے کئی بازار ہیں۔ وہ دونوں ایک مسجد میں چلے
گئے، منہ ہاتھ دھویا اور مولوی صاحب کے ساتھ باتیں کرتے رہے مگر اپنے متعلق
انہوں نے کچھ نہ بتایا۔ لیفٹیننٹ لیٹین کی قمیص ایک جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ مولوی
صاحب سے سوئی دھاگہ لے کر قمیص مرمت کی اور وہاں سے نکل کر ایک اور مسجد میں
چلے گئے۔ وہاں تھوڑی دیر قرآن کی تلاوت کی۔

خاصا وقت گزار کر باہر نکل گئے اور بازار کا رخ کیا۔ بازار کھل چکے تھے۔ کیپٹن
ظفر گل نے گھڑی ایک دکاندار کو دکھائی اور ساتھ یہ کہانی سنائی کہ ایک دوست سے ملنے
آئے تھے کہ جیب کٹ گئی ہے۔ دوست بھی نہیں ملا۔ اب واپس جانے کے لئے پیسے
نہیں رہے۔ دکاندار نے گھڑی کی رسید مانگی۔ کیپٹن ظفر گل نے کہا کہ رسید اٹھائے
اٹھائے کون پھرتا ہے، آپ گھڑی لے لیں، لیکن دکاندار نے انکار کر دیا۔

اس طرح وہ بہت سے دکانداروں کے پاس گئے اور گھڑی پیش کی، مگر رسید دیکھے
بغیر کوئی بھی گھڑی لینے پر آمادہ نہ ہوا۔ کیپٹن ظفر گل اور لیفٹیننٹ لیٹین نے دو تین
دکانداروں سے کہا کہ گھڑی رکھ لیں اور کچھ رقم دے دیں، ہم کسی دن آ کر رقم ادا کر
دیں گے اور گھڑی لے جائیں گے، مگر کوئی بھی راضی نہ ہوا۔ ایک مسلمان دکاندار کو گھڑی
دکھائی اور یہی کہانی سنائی۔ اس نے ان دونوں کو مصیبت زدہ مسلمان سمجھ کر پانچ روپے
دیئے اور کہا کہ یہ پیسے لیں اور گھڑی بھی لے جائیں۔ انہوں نے روپے قبول
نہیں کئے اور کہا کہ ہم خیرات نہیں مانگ رہے۔ آپ گھڑی رکھ لیں اور اس کی واجبی
قیمت دے دیں مگر اس نے گھڑی نہیں خریدی۔

وہ جب کانپور بازار میں گھڑی بیچ رہے تھے، فتح گڑھ کیمپ میں فرار کا
انکشاف ہو چکا تھا۔ صبح افسروں کی گنتی کے لئے "فال ان" کیا گیا تو پانچ افسر کم تھے۔
ہمارے افسروں نے جو فتح گڑھ کیمپ سے رہا ہو کر پاکستان میں آ چکے ہیں، بتایا
ہے کہ اپنے پانچ افسروں کو سرنگ میں رخصت کر کے وہ رات بھر سو نہ سکے۔ دو
خیال ہر ایک افسر کو پریشان کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ بھاگنے والے پکڑے گئے تو
انہیں بڑی ہی اذیت ناک سزا ملے گی، اور دوسرا خیال یہ کہ وہ پکڑے جائیں یا نکل
جائیں، کیمپ میں رہ جانے والے افسروں کو سنگین سزا ملے گی۔ انہیں صبح رول کال
کے لئے کھڑا کیا گیا تو بھارتی افسر بھانپ گئے کہ پاکستانی افسروں کی مزاجی کیفیت
بدلی بدلی سی ہے، ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ انہوں نے ہمارے افسروں کو گن کر پوچھا
کہ باقی پانچ کہاں ہیں۔ انہوں نے وقت ضائع کرنے کے لئے لاعلمی کا اظہار کیا اور

انہیں تلاش کرنے کو بھی کہا۔ وہ وقت اس لئے ضائع کر رہے تھے کہ بھاگ نکلنے والوں کو کچھ اور دُور نکل جانے کا وقت مل جائے۔

خاصا وقت ضائع کر کے انہوں نے بتا دیا کہ پانچ افسر سرنگ کھود کر نکل گئے ہیں۔ الارم بج گئے۔ بھارتی افسر اکٹھے ہو گئے۔ بریگیڈیئر اور جنرل آ گئے۔ انہیں غسل خانے میں لے جا کر سُرنگ کا دہانہ دکھایا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ کوئی بھارتی افسر سرنگ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ چھوٹے عہدوں کے افسر سرنگ کے دوسرے سرے تک گئے اور رپورٹ دی کہ "سرنگ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔" بھارتی فوج کے جرنیلوں نے پیچھے رہنے والے پنتالیس افسروں کے لئے سزا تو تجویز کر دی، لیکن وہ ان کے تعاون، باہمی پیار اور جذبۂ ایثار اور نکل جانے والوں کو جرأت اور جذبے کی بے ساختہ داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ فوراً پولیس کو خبردار کر دیا گیا۔ ملٹری انٹیلی جنس بھی حرکت میں آ گئی۔

ہمارے باقی پنتالیس افسروں کو سہولتوں سے محروم کر دیا گیا اور اُن کا راشن آدھا کر دیا گیا۔ انہیں صرف ایک چپاتی اور گلی سڑی سبزی یا دال سارے دن کے لئے دے دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے پانچ ساتھیوں کی خاطر یہ سزا خندہ پیشانی سے برداشت کی

اخباروں کو بھی خبر دے دی گئی۔ پولیس اور فوج نے تلاش کا جال بچھا دیا۔ اُس وقت گل اور لیئین کانپور میں تھے، جہاں شام ہو گئی۔ آخر ایک دکاندار نے ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پنتالیس روپے میں گھڑی خرید لی۔ اومیگا گھڑی کے پنتالیس روپے اصل قیمت کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھے، لیکن مجبوری ایسی تھی کہ انہوں نے قبول کر لئے۔ بھوک پریشان کر رہی تھی۔ انہوں نے کچھ کھایا پیا اور رات کی گاڑی سے روانہ ہو گئے۔ پیسوں کے مطابق ٹکٹ لئے۔ طویل سفر کے بعد مغل سرائے پہنچے۔ یہ بھارت کا ایک بہت بڑا جنکشن ہے۔ وہاں سے بھارت کے ایک اور بڑے شہر میں پہنچے۔ جس کا نام مصلحتاً ظاہر نہیں کیا جا رہا ہے۔

ان کے پاس پیسے پھر ختم ہو گئے۔ انہوں نے پیسوں کے حصول کی یہ سکیم بنائی کہ رہزنی کریں گے۔ کسی ہندو کو لوٹیں گے۔ اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اسے قتل بھی کر دیں گے۔

انہوں نے یہ انتہائی اقدام سکیم میں شامل کر لیا مگر التوا میں ڈالے رکھا۔ اس سے پہلے وہ مدد کے ایک اور ذریعے کو آزمانا چاہتے تھے۔ یہ ذریعہ وہاں کے مسلمان تھے۔ انہیں توقع تھی کہ بھارت کے مسلمان ان کی ضرور مدد کریں گے۔

انہوں نے اندھا دھند کسی مسلمان کے پاس جانا مناسب نہ سمجھا۔ یہاں عقل اور فہم و فراست کی ضرورت تھی۔ دونوں نے اس مسئلے پر غور کیا تو ایک ترکیب سوجھی۔ اس کے مطابق انہوں نے ریلوے سٹیشن پر ٹیلیفون ڈائرکٹری دیکھی اور اس میں مسلمانوں کے فون نمبر دیکھنے لگے۔ وہ کسی بڑے پیمانے کے کاروباری مسلمان کا ایڈریس تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے چند ایک مسلمانوں کے ایڈریس نوٹ کر لئے اور یہ بھی دیکھ لیا کہ کون کیا کاروبار کرتا ہے۔ انہوں نے ایک مسلمان کا انتخاب کیا۔

راستہ پوچھتے پوچھتے اس کے محلے میں پہنچ گئے اور وہاں اس کا گھر معلوم کر لیا۔ اور مکمل خود اعتمادی سے اس کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور انہیں اندر بٹھایا گیا۔ ایک بوڑھے نے ان کا استقبال کیا۔ کیپٹن ظفر گل اور لیفٹیننٹ لیئین نے اس کی فرم کی مصنوعات کا نام لے کر کہا کہ وہ دونوں ایجنٹ ہیں اور یہی کاروبار کرتے ہیں۔

کاروباری باتوں کو ملتوی کر کے انہوں نے بوڑھے کے ساتھ مشرقی پاکستان کے المیہ کی بات شروع کر دی اور بوڑھے کے ردِّعمل اور تاثرات کو بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بوڑھے کے دل میں پاکستان کی کچھ محبت ہے یا وہ محض کاروباری آدمی اور برائے نام مسلمان ہے۔

گل اور لیئین پاکستان کے ساتھ ہمدردی اور مشرقی پاکستان کے متعلق افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ بوڑھا ان کا ساتھ دیتا رہا۔ اُس کے دل میں پاکستان کی محبت تھی۔ تب کیپٹن ظفر گل نے اُسے کہا "محترم! ہم ایجنٹ نہیں ہیں۔ ہم بھارتی قیدی ہیں اور مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آئے ہیں۔ آپ سے یہ مدد لینے آئے ہیں کہ ہمیں کسی طرح مغربی پاکستان پہنچا دیں۔"

بوڑھا گھبرا گیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس میں مدد کی کوئی ہمت نہیں۔ اس کا ایک جواں سال بیٹا پاس بیٹھا سن رہا تھا۔ اس کی جوانی جوش میں آ گئی۔ وہ کیپٹن ظفر گل اور لیفٹیننٹ لیئین کو اپنی فیکٹری میں لے گیا اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ اب اسے اس راز کے لئے تیار کرنا

تھا کہ یہ دونوں مفرور قیدی ہیں۔ کسی شہری پناہ گزین کو پناہ دینا تو کوئی جرم نہیں لیکن مفرور قیدی کو پناہ دینا بہت بڑا جرم ہے۔ اور جب مجرم مسلمان اور مُنصف ہندو ہو تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ سزا کیا ہوگی اس لئے اس جوان سال مسلمان کے تاثرات اور جرأت کو بھانپنا ضروری تھا۔

گل اور یسین نے اس کے ساتھ جنگی قیدیوں کی بات شروع کر دی اور اسے بتایا کہ پاکستانی فوج کو انہوں نے مجبور کر دیا تھا، ورنہ ہتھیار کبھی نہ ڈالے جاتے ان باتوں میں انہوں نے پاک فوج کی مخالفت بھی کی جو اس آدمی کو اچھی نہ لگی۔ کیپٹن ظفر گل اور لیفٹیننٹ یسین کی کہنیوں پر زخم تھے۔ جما ہُوا خون صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جسے وہ بش شرٹوں کی آستینوں سے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس جوان سال بھارتی مسلمان نے ان سے کہنیوں کے زخموں کے متعلق پوچھا۔ اس وقت تک یہ دونوں یقین کر چکے تھے کہ یہ مسلمان قابلِ اعتماد ہے۔ انہوں نے اسے کہا — "اب ہم سے اصل راز سُن لو۔ ہم فتح گڑھ قیدی کیمپ سے بھاگے ہوئے پاکستانی قیدی ہیں، اور یہ زخم دو سو فٹ لمبی سرنگ میں آئے ہیں۔"

وہ جوان بظاہر خوش ہُوا۔ اس نے انہیں اس صبح کا ایک اردو اخبار دکھایا جس میں فتح گڑھ کیمپ سے پانچ پاکستانی افسروں کے فرار کی خبر چھپی تھی۔ یہ خبر انگریزی اخباروں میں بھی شائع ہوئی تھی۔ گل اور یسین نے اپنے فرار کی خبر پڑھی۔

یہ آدمی باہر نکل گیا۔ اسے جوں جوں واپس آنے میں دیر ہو رہی تھی، دونوں مفرور پریشان ہوتے جا رہے تھے۔ آدھا گھنٹہ گذر گیا مگر وہ نہ آیا۔ تب انہیں اس خطرے کی بو آنے لگی کہ یہ آدمی پولیس لے کے آئے گا، اور یہ ان کے سفر کا خاتمہ ہوگا۔ وہ وہاں سے نکلنے کے متعلق سوچنے لگے۔ وہ آدمی کچھ بھی بتا کر نہیں گیا تھا۔ دال میں کچھ کالا تھا۔ پورا ایک گھنٹہ گذر گیا اور وہ آ گیا مگر اس کے ساتھ پولیس نہیں تھی۔ پولیس شاید باہر کھڑی ہوگی یا آ رہی ہوگی۔ اس آدمی کا جوش و خروش کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کی بجائے کھانا آیا۔ مرغ سالن اور پلاؤ تھا۔ پُر تکلف اور نہایت معیاری کھانا تھا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ اس آدمی نے تمام شکوک رفع

کر دیئے اور یقین دلایا کہ وہ انہیں بھارت سے نکالنے کا انتظام ہر قیمت پر کریگا۔ کیپٹن ظفر گل اور لیفٹیننٹ یسین نے اسے بتایا کہ وہ کشمیر یا نیپال چلے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ مغربی پاکستان کی سرحد سے داخل ہونا بہت ہی خطرناک ہے کیونکہ دونوں طرف نگرانی بڑی سخت ہوتی ہے۔ اُس وقت دونوں ملکوں کی فوجیں سرحد پر مورچہ بند تھیں۔ وہاں سے گزرنا کسی پہلو ممکن نہ تھا۔

اس بھارتی مسلمان نے ان دونوں کو نہلایا دھلایا اور فیکٹری میں ہی چھپائے رکھا۔ ان کے لئے نئے کپڑے اور اچھی قسم کے چپل منگوائے۔ انہیں بیگ منگوا دیئے اور مختلف فیکٹریوں کی مصنوعات کا لٹریچر اور نمونے دیئے۔ دو سو روپیہ نقد دیا اور نقشے پر انہیں بھارت کا وہ آخری ریلوے سٹیشن دکھایا جو نیپال کی سرحد پر ہے۔ نیپال اور بھارت کے درمیان ویزا کی کوئی پابندی نہیں۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے کوئی چیکنگ نہیں ہوتی۔ اس مسلمان نے ان دونوں کو باقاعدہ ایجنٹ بنا کر پوری رہنمائی کی اور اسلام کے مقدس نام پر انہیں رخصت کیا۔ اس بہروپ میں انہیں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھے اور نیپال کی سرحد پر بھارت کے آخری ریلوے سٹیشن پر جا اُترے۔ وہاں سے ٹہلتے ٹہلتے نیپال میں داخل ہو گئے۔ اب وہ آزاد تھے۔ فتح گڑھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر مہندر سنگھ کی پولیس اب ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ وہ کھٹمنڈو چلے گئے اور اپنے سفارت خانے میں گئے۔ پاکستان کے سفیر سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ بہت خوش ہُوا اور انہیں خاصی رقم دے دی۔ چند ہی دنوں بعد انہیں بذریعہ طیارہ تھائی لینڈ اور برما کے راستے کراچی بھیج دیا گیا۔

ان کے پہنچنے کے دس روز بعد میجر نادر پرویز، میجر طارق پرویز اور لیفٹیننٹ نور احمد بھی کراچی پہنچ گئے۔